انوکھی مُسکراہٹ

(افسانے)

سیّد محمّد مُحسن

ناشر

کتاب منزل، سبزی باغ
پٹنہ ۴

تاریخ اشاعت : جون ۱۹۷۳ء
کاتب : قمر نظامی معروف گنج گیا
مطبع : دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ ۴
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر، نئی دلی
قیمت
چھ روپئے

ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ

کے نام

جس نے ہمیں

شخصیتوں کے آئینہ خانہ میں
اپنے آپ کو پہچاننا سکھایا۔

ترتیب

یہ افسانے

معلوم نہیں میرے افسانوں کا مجموعہ ناظرین کے اندر کس طرح کا تاثر پیدا کرے گا۔ یہ افسانے آج سے چوتھائی صدی پہلے لکھے اور شائع کئے گئے۔ ان کا زمانہ تخلیق ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۴ء کی قلیل مدت ہے۔ اُس دور کے افسانوی ادب سے آشناؤں کی ایک بڑی تعداد آج اللہ کو پیاری ہو چکی ہے ـــــــ راقم کو افسانہ نگار کی حیثیت سے جاننے والے شاید ڈھونڈنے پر دو چار نکل آئیں۔ ہاں اس مجموعہ کا ایک افسانہ "انوکھی مسکراہٹ" اردو افسانہ کی تاریخ میں کچھ ایسا ناقابل فراموش تاثر چھوڑ گیا کہ چھتیس سال گذر جانے کے بعد اب تک بہار کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں قدیم و جدید افسانوں کے انتخاب کے پیش نظر اسے بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ گرچہ عام طور سے اس افسانہ کے مصنف کی شخصیت اس شخص سے الگ سمجھی جاتی ہے جسے لوگ پروفیسر سید محمد محسن، معلم نفسیات، کی حیثیت سے جانتے ہیں ـــــــ!

"انوکھی مسکراہٹ" صرف میرا پہلا شائع شدہ افسانہ ہی نہیں، بلکہ یہ میری اولین افسانوی کوشش ہے۔ اس کے بعد میں نے اُس دور کی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر ایک دوسرے طرز کا افسانہ "مزدور کا بیٹا" لکھا جو اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے، یہ افسانہ بھی ساقی کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوا تھا اور چند سال تک میٹریکولیشن کورس کے منتخب ادبی نگارشات میں اسے بھی جگہ ملتی رہی۔ اس کے بعد میں نے اپنی ہر افسانوی تخلیق کو "انوکھی مسکراہٹ" کے طرز پر ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا اور بعد میں جو افسانے لکھے مواد کے اعتبار سے ان میں ایک مستقل تسلسل قائم رکھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے افسانوں میں "انوکھی مسکراہٹ" کو سب سے زیادہ مقبولیت کیوں حاصل ہوئی۔ اس کا ترجمہ ہندی میں "انوکھی مسکان" انگریزی میں "سونیا" اور چند دوسری ہندوستانی زبانوں میں دوسرے عنوان کے ساتھ شائع ہوا۔ ہندی میں جب یہ افسانہ

شائع ہوا تو بہار کے ہندی کے دو ممتاز اور معروف ادیب آنجہانی ڈاکٹر راجہ رادھیکا رمن پرشاد سنہا مدیر "نئی دھارا" (جس میں انوکھی مسکان شائع ہوا تھا) اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے صدر آنجہانی پروفیسر رام ولوچن شرما، افسانہ پڑھنے کے بعد میری ملاقات کے مشتاق بن گئے تھے۔ شاعر بہار علامہ جمیل مظہری اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد مجھ سے خاص طور پر ملے۔ یہ پہلی ملاقات تھی اور اس موقع پر انھوں نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ اس کے بعد وہ افسانہ لکھنا ترک کر دیں گے۔ میری دانست میں انھوں نے اس پر عمل بھی کیا۔ میں نے یہ افسانہ جس تاثر کے تحت لکھا تھا اس کا ذکر شاید نامناسب نہ ہوگا۔ میرے پھوپھی زاد بھائی کا ایک آٹھ دس سالہ لڑکا فوت ہوگیا۔ ہم لوگ اس کا جنازہ شہر کے قدیم گورستان پیر مہاری بن سپردِ خاک کرنے کے لئے لے گئے۔ قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی۔ ہم سب جنازہ سامنے رکھے غم سے چور منتظر بیٹھے تھے۔ گورستان کا مجاور مزدوروں کو قبر کی کھدائی پر مستعد کئے ہوئے تھا۔ ہم سے کچھ دور پر ایک الھڑ دوشیزہ جنازہ پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو اس سوگوار پس منظر میں نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میرے دماغ پر مرتسم ہو گئی۔ دوسرے ہی دن میں نے اس تاثر کو افسانہ کے قالب میں ڈھال دیا۔ ساقی میں اشاعت کی غرض سے بھیجنے کے پہلے میں نے جب اسے اپنے چند ادبی احباب کی موجودگی میں پڑھا تھا تو میرے ایک عزیز دوست نے، جو آج آسمانِ ادب کے ایک درخشندہ ستارہ کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں عالمگیر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، افسانہ میں تکنیک کے اعتبار سے متعدد خامیاں بتائیں۔ وہ کچھ ہی دن پہلے انگریزی ادب کے طالب علم رہ چکے تھے اور ان کے اپنے دو چار افسانے بھی شائع ہو چکے تھے۔ میں ان کی گفتگو سے متاثر تو ہوا لیکن پھر بھی میں نے افسانہ جوں کا توں ساقی کو بھیج دیا۔ مرحوم شاہد احمد دہلوی، ایڈیٹر ساقی نے، جو اس سے پہلے مجھ سے واقف نہ تھے اور بعد میں میرے ان کے دوستانہ تعلقات ہو گئے، افسانہ کو ساقی کے افسانہ نمبر میں جگہ دی۔ ان دنوں معیاری افسانوں کی اشاعت کے سارے رسائل میں ساقی کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ شاہد مرحوم نے

جب ساقی میں دس سال کے اندر شائع شدہ افسانوں کا انتخاب ''ریزہ مینا'' کے نام سے شائع کیا تو "انوکھی مسکراہٹ" کو بھی اس میں جگہ ملی۔

ہاں، تو آپ کو بتانے سے پہلے میں خود اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرا یہ افسانہ، میری اولین افسانوی تخلیق ہونے کے باوجود اتنا زیادہ مقبول کیوں ہوا۔ میں جب اپنے دوسرے افسانوں کو پڑھتا ہوں تو ان میں سے کئی ہر اعتبار سے مجھے اس افسانہ کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔ شاید جس طرح والدین کو اپنی ہر اولاد پیاری ہوتی ہے، میرے دوسرے افسانے اس افسانہ سے کمتر نہیں دکھائی پڑتے ——— لیکن نفسیاتی طور پر اس کا ایک سبب سمجھ میں آتا ہے۔ "انوکھی مسکراہٹ" اپنے طرز کا انوکھا افسانہ تھا۔ اس سے پہلے کسی نے اس رنگ کا افسانہ نہیں لکھا تھا۔ اس لئے ناظرین کے ذہن پر اس افسانہ نے جو نقش چھوڑا، ان کی نگاہوں سے گزرتے ہوئے سارے افسانوں کے نقش سے جداگانہ تھا میرے دوسرے افسانے اسی ڈھانچہ پر تیار ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس نقشِ اول کے سامنے ان میں کوئی اچھوتا پن باقی نہیں رہا تھا۔ "انوکھی مسکراہٹ" نے جو سب سے نرالا تاثر ناظرین کے اندر پیدا کیا تھا، میرے دوسرے افسانے اسے صرف جگاتے رہے۔ وہ ناظرین کو "انوکھی مسکراہٹ" کی طرح چونکا نہ سکے۔ اس لئے انہیں میرے افسانوں میں "انوکھی مسکراہٹ" سب سے اچھا لگا۔

آپ مجھ سے سوال کریں گے کہ باوجود مقبولیت کے میں نے ۱۹۴۴ء کے بعد کوئی افسانہ کیوں نہیں لکھا؟ ——— دوسری جنگِ عظیم کے اختتام کے ساتھ ہی ساتھ میری افسانوی صلاحیت کے سوتے کیوں خشک ہو گئے؟ ——— تو سنئے، جنگ سے پہلے گورنمنٹ کالجوں کے دو تین اساتذہ کو ہر سال مزید تعلیم کی غرض سے اس وقت کی سرکار انگلستان بھیجا کرتی تھی۔ جنگ کے دوران میں یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ جنگ کے بعد اسے پھر شروع کیا گیا۔ اور پہلے ہی کھیپ میں اسٹڈی لیو کے لئے میرا بھی انتخاب ہو گیا۔ میں انگلستان

چلا گیا۔ اس سے پہلے میں پٹنہ کالج کے شعبۂ فلسفہ میں لکچرر تھا۔ اور ویسی ہی نفسیات پڑھاتا پڑھانا تھا جس کی کھپت فلسفہ کے نصاب میں ہوسکتی تھی۔ انگلستان پہونچا تو مجھے اس نفسیات سے دوچار ہونا پڑا جو فلسفہ سے دور اور مابعد الطبیعات اور عمرانیات سے نزدیک تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کے نظریات قیاس آرائی پر مبنی ہونے کے بجائے تعقل و تجربہ، واقعات و مشاہدات پر قائم کئے جانے لگے تھے۔ دوسرے سائنس کی طرح علم الحساب نے بھی اس کے اندر ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا۔ مجھے تخیل اور افسانہ کی دنیا سے نکل کر ٹھوس حقیقتوں سے وابستگی کی مشق کرنی پڑی۔ کسب کمال کی ہوس ہمیشہ تسمۂ پا کی طرح مجھ سے چمٹی رہی۔ جس کی وجہ سے اپنی ہر پونجی کو، ہیچ میرزی کا شکار بناتا اور اسے شاہراہِ عام پر لانے سے گریز کرتا رہا ہوں۔ چنانچہ جس کام میں لگا اس وقت صرف اسی کا بن کر رہ گیا۔ انگلستان سے لوٹا تو اردو ادب سے ایسا بیگانہ ہوگیا جیسے اس سے کبھی کی آشنائی نہ تھی۔ اردو کی کتابوں کے لئے وقت نکالنا تو دور کی بات تھی، اردو کے رسائل بھی اگر ریل کے سفر میں ہاتھ میں آجاتے تو صرف غزلیں پڑھ کر انہیں کنارے کر دیتا۔ نفسیات کی کوئی نہ کوئی انگریزی کتاب سفر میں ہمیشہ ساتھ رہتی جو رسالہ کے دوسرے مضامین پر وقت صرف کرنے کی اجازت نہ دیتی۔ اللہ بھلا کرے میرے عزیز دوست سہیل عظیم آبادی کا، جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں اردو پروگرام کے انچارج ہو کر پٹنہ میں منتقل ہوگئے تو ریڈیو کے لئے اردو میں مجھ سے مضمون لکھوانے کا سودا ان کے سر پر سوار ہوگیا۔ گاہے گاہے میں مختلف موضوعات پر مضمون لکھ کر سامعین کے آگے پیش کرنے لگا۔ اس طرح اردو نگارش سے میرا تعلق ازسرِ نو زندہ ہوگیا۔ اور چند بسیط مقالے اردو رسائل کے ذریعہ منظر عام پر آگئے۔ لیکن دماغ کے کسی گوشہ میں افسانوی تخلیق کی گونج نہ پیدا ہوسکی۔

میں جب انگلستان سے لوٹا تھا تو ملک کی تقسیم ہو چکی تھی۔ شاہد احمد بھی لُٹ پٹ کر کراچی جا چکے تھے اور ساقی اب کراچی سے شائع ہو رہا تھا۔ ابتدا میں ہندوستان اور پاکستان کا کوئی بنایا پُرانا رسالہ ایسا نہ تھا جس کے مدیر مجھ سے افسانہ کی فرمائش نہ کرتے۔ میں سب کا جواب خموشی سے دیتا رہا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کا مطالبہ بند ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد نفسیاتی افسانہ نگار محسن اور نفسیات کا پروفیسر ڈاکٹر سید محمد محسن دو مختلف شخصیتیں بن کر رہ گئیں ——— آپ کو تعجب ہو گا کہ اس مغالطے کے شکار عزیزی شہباز حسین بھی ہو گئے جو حال میں "آج کل" کی ادارت سے علیحدہ ہو کر اردو ترقی بورڈ کے سکریٹری کا فرض انجام دے رہے ہیں اور مجھے بہت نزدیک سے جانتے ہیں۔ میرے عزیز ترین دوست پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے ایک طالب علم رضوان احمد کو میرے افسانوں پر ایم۔ اے کی تھیسس تیار کرنے کا فرض سونپ دیا۔ اختر اورینوی نے میری ادبی نگارشوں کی یاد قائم رکھنے کے لئے موقع بہ موقع اپنی تحریروں میں میرا ذکر شامل کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا ہے اور ان کا یہ فعل اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ میرے افسانے دو چار کے سوا میرے پاس محفوظ نہ تھے لیکن مجھے اتنا یاد تھا کہ افسانے کس کس رسالے میں شائع ہوئے تھے ——— چنانچہ رضوان سلمہٗ نے ان رسالوں کو لائبریریوں سے ڈھونڈ نکالا، اور سب افسانے اکٹھے کر لئے۔

موجودہ دور کا اُردو افسانوی ادب آج کس منزل پر کھڑا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ ہر صنف کا ادب واقعات و حالات سے متاثر ہو کر اپنی راہیں بدلتا رہتا ہے۔ گرچہ واقعات و حالات کی بے کم و کاست ترجمانی سے گریز کرنا بھی ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے ——— اس تیس سال کے عرصہ میں زمانہ کی بدلتی ہوئی ہوائیں، حالیہ اردو ادب کو مختلف ساحلوں سے آشنا کر کے کس سمت لے گئی ہیں، جیسا میں نے عرض کیا،

اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ میرا یہ مجموعہ اس اعتبار سے کسی قدر دقیانوسی اور فرسودہ سمجھا جائے گا۔ نئی طرز نگارش، اسلوب بیان، تکنیک اور مواد کے مدنظر اس کے اندر کس کس طرح کی خامیاں محسوس کی جائیں گی، ان باتوں کو سوچ کر اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر حسنین سلمہٗ کے اصرار کے باوجود میں ان افسانوں کی اشاعت سے احتراز کرتا رہا۔ لیکن عزیزی مظہر امام صاحب، اُردو پروگرام پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ، نے مجھے پھر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے شعبۂ اُردو کا مرہون منت بنا دیا۔ انھوں نے میرے کچھ افسانے ساقی کی پرانی فائلوں میں پڑھ لیا۔ بہ غایت مصر ہوئے کہ میرے افسانوں کا مجموعہ شائع ہونا چاہیے۔ ادھر میاں حسنین چھٹیاں گذارنے پٹنہ آگئے اور انہیں بھی شہ مل گئی۔ مجموعہ کی اشاعت سے مجھ سے زیادہ میرے دوستوں اور عزیزوں کا یہ پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔

مجموعہ کی کوئی ادبی حیثیت ہو یا نہ ہو، نفسیاتی افسانوں کی سرگذشت میں اسے ایک تاریخی مقام تو ضرور مل سکتا ہے۔!!

محسن

دارالامان،
پٹنہ، ۴۔

انوکھی مُسکراہٹ

"کیا کر رہی ہو بیٹیا؟" بڈھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کے دل کی غمناکی کے اثر سے۔ جیسے نا اُمیدیوں نے برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔

"کُرتے میں پیوند لگا رہی ہوں بادا۔ کیا ہے؟" جمنی نے باپ کے قریب آ کر کہا۔

"کچھ نہیں شام کے لئے چاول تو نہ ہوں گے۔ دو دن سے کوئی مُردہ نہیں آیا۔ اب صرف یہ اکنیّ ہمارے پاس رہ گئی ہے۔ بیٹیا جب تو بچہّ تھی اُس وقت اسی قبرستان میں روز دو دو، تین تین مُردے آیا کرتے تھے۔ دُور دُور تک کوئی اور قبرستان نہ تھا۔ مجھے دن دن بھر فُرصت نہ رہتی۔ اکیلا آدمی، دفن کا سارا انتظام مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن جو ملتا اُٹھا دیتا —

اس دن کی خبر نہ تھی۔ ایک تو یہاں اب صرف غریبوں ہی کے مُردے آتے ہیں۔ لڑ جھگڑ کر ان سے کہیں دو چار پیسے وصول ہوتے ہیں۔ برس چھ مہینے میں کوئی امیر مسافر مر گیا اور اُس کے عزیز آ گئے تو کچھ رقم مل گئی۔ لیکن آج کل تو ایسا سناٹا ہے کہ دو دو چار چار دن کوئی مُردہ نہیں آتا۔ اب یہ آخری اکنّی رہ گئی ہے۔ کوئی کپڑا ہو تو دو رات کے کھانے کے لئے بازار سے کچھ لیتا آؤں۔ کوئی آئے تو میرا انتظار کرانا۔ کہنا بابا ابھی آتے ہیں۔"

آخری جملے نے بڈھے کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک چمک پیدا کر دی۔ مستقبل کا تصور لاکھ نا اُمیدیوں میں گھرا کیوں نہ ہو، اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

" بڈھے نے اپنی لکڑی اُٹھائی اور جھونپڑی سے نکل گیا۔ اُس کے بدن پر ایک میلی جابجا پیوند لگی سیاہ عبا تھی۔ اس کی کاکلیں لٹکی ہوئی تھیں اور لمبی سفید ڈاڑھی بکھری ہوئی تھی۔ برسوں سے حجام نے انھیں ہاتھ نہ لگایا تھا۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ کمر ضعف سے جُھکی ہوئی تھی۔ ناطاقتی سے پیر چلنے میں ہلتے اور قدم مشکل سے جمتا تھا۔ وہ قبرستان کا مجاور تھا۔ قبرستان آبادی سے بہت دور تھا۔ سُنسان میدان میں یا تو جابجا کچھ پختہ قبروں کے نشان نظر آتے یا بڈھے کا افلاس زدہ جھونپڑا۔ مُردوں کی اس بستی میں صرف یہ دو زندہ جانیں رہتی تھیں جمنی کی ماں اس کے بچپن میں مر چکی تھی۔ بڈھے نے پھر بیاہ نہ کیا۔ وہ جمنی کو بہت چاہتا تھا۔ اِس دنیا میں اس کا جمنی کے سوا کوئی نہ تھا۔

جمنی باپ کے جاتے ہی پھر پیوند لگانے بیٹھ گئی۔ اُسے بھی تعجب تھا کہ اب لوگ کیوں نہیں مرتے۔" اگر مُردے آنا بند ہو گئے تو اس کا باپ کیا کرے گا؟ دال چاول کہاں سے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کو پکا کر کیا دیا کرے گی؟ "

وہ دیر تک سوچ نہ سکی۔ اس کا ذہن ابھی ان حالات پر غور کرنے کا اہل نہ بنا تھا

وہ تو ابھی تصورات کی دنیا میں رہتی تھی۔ اُس کا سن ہی کیا تھا۔ اس کا دماغ صرف ماضی و مستقبل کی آزاد تصویریں پیش کر سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ "پارسال کیا اچھا زمانہ تھا جب سارے شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ قبرستان میں دن بھر لاشوں کا تانتا لگا رہتا۔ اس کا باپ کتنا خوش نظر آتا تھا، باوجود دن رات کی مصروفیت کے۔ اپنے باپ کو کبھی اُس نے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں لاتا۔ اتنی مٹھائی اس نے کبھی نہ کھائی تھی۔ کسی تہوار میں بھی نہیں۔ اُس کے اچھے کپڑے سب اسی زمانہ کے تھے۔ وہ کرتہ بھی جس میں وہ پیوند لگا رہی تھی کیسا اچھا کپڑا تھا۔ اتنا پرانا ہونے پر بھی اس کی آب وتاب ویسی ہی تھی۔ اور وہ ساڑی جو اس نے عید پر پہنی تھی۔ اس کا باپ کہتا تھا کہ وہ ساڑی اُسے بہت بھلی لگتی تھی۔ اب کے تہوار پر وہ پھر اسی ساڑی کو پہنے گی۔"

"جمنی!" بڈھے نے جھونپڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پکارا۔ اُس کے کاکل اور ڈاڑھی کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ کی شکنوں میں خاک کے ذرّے بھر گئے تھے۔ جن سے چہرے کے نشیب و فراز میں کمی ہو گئی تھی۔ قدرت کا کریمانہ ہاتھ دنیت کے تخریبی عمل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈھے کے کاندھے پر دو چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں۔ ان کا وزن کچھ ایسا نہ ہوگا لیکن بڈھے کی کمر اور جھک گئی تھی۔ عمر کا بوجھ اس کی پیٹھ پر کب کم تھا کہ وہ اور زیادہ وزن برداشت کر سکتا۔ زندگی کا بھی وزن ہوتا ہے جو ہر سانس کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اخیر عمر میں کمر جھک جایا کرتی ہے۔

جمنی نے گٹھریاں باپ کے کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھ دیں۔ بڈھا چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ چہرہ کا پسینہ اُڑتی ہوئی خاک کو گوندھ رہا تھا اور سانس کی تیز رفتار سے چہرہ میں جو حرکت پیدا ہو رہی تھی اس سے بھیگی ہوئی خاک کے خردبینی پتلے بن رہے تھے۔ فطرت کی تخلیق یہاں بھی جاری تھی۔

"بیٹا کوئی آیا تھا؟" اس نے جمنی سے سوال کیا۔

"نہیں بابا۔" جمنی نے کہا۔ اور باپ کی پھٹی ہوئی کفنی تہ کر کے الگنی پر ڈالنے لگی۔

"کوئی نہیں؟ اب ہماری قسمت بگڑ گئی ہے۔ ورنہ اتنی کم موت شہر میں شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ باپ دادا کا پیشہ ہے، چھوڑا نہیں جاتا۔ پیالہ لے کر در بدر بھیک مانگتا تو اس سے بہتر ہوتا۔ پھر اپنی غیرت بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس وقت لوگ مجھ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص شاہ صاحب، شاہ صاحب کہتا ہے۔ بھیک مانگنے نکلوں گا تو جانے کون کس طرح پیش آئے۔ مگر اب اس پیشہ سے روٹی کیونکر چلے گی۔ جوانی تو اس عیش میں گذری اب بڑھاپے میں ایسی مصیبت۔ یا اللہ!" بڈھا یہ کہہ کر رونے لگا۔ آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے گرد آلود چہرے پر اپنا نشان چھوڑ کر بڈھے کی ڈاڑھی میں کھو گئے۔ باپ کو روتا دیکھ کر جمنی باپ کے گلے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ دنیا والے کسی کی موت پر روتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی دنیا والوں کی زندگی پر آنسو بہا رہے تھے —

رات کے دو بجے تھے۔ بڈھا چٹائی پر بیٹا کھانس رہا تھا۔ جمنی بے فکری کی نیند سو رہی تھی۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی۔ بڈھے کا دماغ مستقبل پر غور کرنے میں منہمک تھا۔ "اس کے بعد دنیا میں جمنی کا کوئی نہیں۔ اس کی زندگی کس طرح گذرے گی؟ اگر وہ اسے بیاہنے سے پہلے مر گیا تو پھر اس کا بیاہ کیونکر ہوگا۔" اسے جمنی کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔ رات کی تاریکی میں جھونپڑی کے اندر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ایک لو تھی۔ لیکن اس کے دماغ کے اندھیارے میں کہیں روشنی کا نشان نہ تھا۔

"شاہ صاحب!" ماحول کی بسیط خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں پہنچی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ جھونپڑی کے باہر ایک شخص اسے پکار رہا تھا۔

"کون ہے؟ مجھ کو بلاتے ہو۔ کیا کام ہے؟"

"دلّی والے سوداگر کے لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ جنازہ صبح سویر یہاں آئے گا۔ آپ قبر وغیرہ کا انتظام درست رکھئے۔"

دلّی والے سوداگر کا نام سُن کر بڈھے کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ یہ ایک پردیسی بڑے تاجر تھے۔ بڈھے کو روپئے کافی مل جائیں گے۔ غایت مسرّت میں اس نے رات کا باقی حصہ آنے والے روپیوں کی چمک اور چھنک کے تصور میں جاگ کر گذار دیا۔ اور صبح سے پہلے قبر کے انتظام میں جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اس کی سوکھی ہوئی ٹانگوں میں پھُرتی آگئی تھی اور کمر کی خمیدگی میں کچھ کمی۔ مسرت و انبساط میں ہی قوت و توانائی کا راز مضمر ہے۔ اس کا لگاؤ مستقبل کے خیالی شہ پاروں ہی سے کیوں نہ ہو۔

جمنی صبح اُٹھ کر جھونپڑی میں جھاڑو دے رہی تھی۔ باہر سے کچھ لوگوں کے گذرنے کی آواز آئی۔ جمنی دروازے پر آکر دیکھنے لگی۔ بہت سارے آدمی ایک جنازہ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ "کیسا کڑیل جوان تھا۔"

دوسرے نے جو قریب ہی سے جنازہ کے ساتھ ہوگیا تھا سوال کیا۔ "آخر اس بے چارے کو ہوا کیا تھا؟"

"کیا بتائیں بھائی۔" پہلے نے جواب دیا۔ "ایک عورت سے اس کا کچھ دنوں سے تعلق تھا۔ اس چڑیل نے اپنے ایک آشنا کے بہکانے سے کل رات اس بیچارے کو زہر دے دیا۔ دن بھر اس کی حالت خراب رہی

اور آخر سہ پہر سے پہلے رخصت ہوگیا۔ افسوس میرا بڑا دوست تھا۔"

جمنی ان کی گفتگو بہ غور سنتی رہی ور جب وہ کچھ آگے نکل گئے تو جانے پر نظریں جمائے بے اختیارانہ ہنسنے لگی، اور پھر جھونپڑی کے اندر جاکر جانے کب تک ہنستی رہی۔ جھاڑو دیتے میں آج اُسے ایک خاص لذت محسوس ہو رہی تھی وہ اور دن جلد جلد جھاڑو دے کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتی لیکن آج اس کا جی چاہتا تھا کہ برابر جھاڑو دیتی رہے اور ساتھ ہی ہنستی جائے۔ آج اس کے جھاڑو دینے کے انداز میں رقص کی کیفیت تھی۔ جھاڑو کی حرکت اور کمر کی جنبش میں ایک انوکھی ہم آہنگی تھی۔

بڈھا قبرستان سے جھونپڑی میں آیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ چہرے پر غائت انبساط سے ایک ہلکا گداز پیدا ہوگیا تھا۔ جس سے چہرے کی شکنوں میں پھیلاؤ آگیا تھا۔ بڈھے کا مُردہ شباب اپنے اعادہ کی کوشش کر رہا تھا۔ مسرت کی برقی رَو نے اس میں جان ڈال دی تھی۔ انسان اگر ہمیشہ مسرور ہی رہتا تو وہ کبھی بوڑھا نہ ہوتا۔ لیکن پھر مسرت بھی تو بے معنی و بے اثر ہو جاتی۔ بڈھے کو روپئے کافی مل گئے تھے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں جمنی کے حوالے کیا۔ جمنی نے ایک سال سے اتنے روپئے نہ دیکھے تھے۔ دیر تک ہتھیلی پر رکھے انھیں دیکھتی رہی۔ چاندی کے سکّوں کی تابانی اس کے چہرے پر چمک پیدا کر رہی تھی۔

"جمنی!" حنیف نے باہر سے آواز دی۔ اس کے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔ ہر ہفتہ اُسے پاس کی بستی میں ڈاک لے جانا ہوتا تھا۔ آتے جاتے وہ اکثر بڈھے کے یہاں کچھ دیر بیٹھ جاتا۔ جمنی اپنے باپ کے علاوہ صرف حنیف کو جانتی تھی وہ اس سے بے باکانہ باتیں کرتی۔ وہ سوسائٹی کی ان رُکاوٹوں سے آزاد تھی،

جنھیں شرم و حجاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حنیف جوان تھا۔ خوبصورت بدن، لانبے قد والا۔ بڈھے کو اس سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ جمنی سے اس کا آزادانہ ملنا اُسے ناگوار نہ ہوتا۔

"کیوں؟ شاہ صاحب کہاں ہیں؟"

"بازار گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ تم اس ہفتہ نہ آئے تھے۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہی۔ بابا بھی پوچھ رہے تھے۔"

"اس دن میں چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا۔ تم راہ کیوں دیکھتی رہیں۔ کیا کوئی کام تھا؟"

"نہیں تو یوں ہی پوچھ لیا۔ گمان ہوا کہ شاید تم بیمار پڑ گئے۔ نہیں آنا تھا تو پہلے کہہ دیتے۔ ہم لوگوں کو کچھ خیال نہ ہوتا۔"

"گھر سے بھائی کی ایکا ایکی چھٹی آ گئی، وہ بیمار ہو گئے تھے۔ اسی دن چھٹی کی درخواست منظور کرا کر چلا گیا۔ تمہاری طرف آنے کا وقت نہ ملا۔ کیا تم دن بھر انتظار کرتی رہیں؟"

حنیف کی گفتگو میں محبت کی حلاوت تھی۔ اس کی آنکھیں اس کا راز فاش کر رہی تھیں۔ حنیف کو جمنی سے محبت تھی۔ انتہاء۔ گو اس کا احساس ان دونوں میں سے کسی کو نہ ہوا تھا۔ محبت اپنا پہلا وار چوری سے کیا کرتی ہے اس طرح کہ محبت کرنے والے کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔ پھولوں کی مار سے بھی چوٹ لگتی ہے لیکن اس چوٹ کا احساس چوٹ کی طرح نہیں ہوتا۔

"کیوں انتظار کرتی رہتی؟ کیا کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ تھا۔"

جمنی کے جواب میں شوخی و شرارت کی آمیزش سے ایک دلکش لوچ پیدا ہو گیا تھا۔ حنیف اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اچھا اب جاتا ہے۔ بہت سی ڈاک باقی رہ گئی ہے۔ شاہ صاحب کو

میرا سلام کہہ دینا۔"

بڈھا بخار سے ہانپ رہا تھا۔ جمنی سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی۔ بڈھے کو دو دن سے بخار تھا۔ شدّت کی کھانسی کے ساتھ۔ اس سنسان آبادی میں کوئی نہ تھا کہ بڈھے کے لئے کہیں سے دوا لا کر دیتا۔ بڈھے کا بخار بڑھتا گیا یہاں تک کہ دماغ پر اثر ہو گیا۔ جمنی نے آج تک کسی کو بیمار ہوتے نہ دیکھا تھا اس کی ماں اس کے بچپن میں مرگئی تھی۔ اور اس کا باپ کبھی اس طرح بیمار نہ ہوا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ اس بیماری کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں بڈھے کی تکلیف دیکھ کر اُسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ باپ کو "بادا، بادا" کہہ کر آواز دیتی اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو اسے ایک غم آلود حیرانی واستعجاب ہو جاتا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ بڈھا دم توڑ رہا تھا۔ اور جس طرح اس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے سورماؤں کو زمین کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اس کا نشان بھی خاک کے اندر کھو دیا جانے والا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے بڈھے کی روح پرواز کر گئی۔ جمنی نے مُردے ہزاروں دیکھے تھے لیکن کفن کے اندر ڈھکے ہوئے موت کا منظر اس نے پہلی بار دیکھا۔ اس کے باپ کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، سانس کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ بدن سرد ہو گیا تھا۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کے دل میں گداز پیدا ہوا، اور وہ بے اختیارانہ رونے لگی۔ اس لئے نہیں کہ اس کا باپ اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے باپ کی اس غیر معمولی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے آنسو اس کے فہم و ادراک کی مجبوری کا اظہار تھے

صبح کو حسب معمول حنیف ڈاک کا تھیلا لیے جھونپڑی میں داخل ہوا۔

جمنی اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ دیر سے حنیف کی منتظر تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے باپ کی اس غیر معمولی کیفیت کا راز اُسے بتا سکے گا۔ حنیف سے اس نے بارہا مختلف باتوں کی بابت سوال کیا تھا۔ اور اس نے برابر اس کی تشفی کر دی تھی

"دیکھو تو بادا کو کیا ہو گیا ہے؟"

حنیف نے بڈھے کے قریب جا کر دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ جمنی بھی رونے لگی۔

"شاہ صاحب سدھار گئے، اُن کے دفن کا سامان کرنا چاہئے۔"

حنیف نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر میں حنیف چند آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا۔ جنازہ تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جایا جانے لگا تو جمنی کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرانے لگی۔ اور جب تک جنازہ اس کی نظروں کے سامنے رہا مسکراتی رہی۔ جنازہ دفن ہو چکا تو ایک بارگی اس پر افسردگی چھا گئی۔ قبرستان سے لوٹنے والوں میں اس کا باپ نہ تھا۔ یہ اُس کے لیے ایک غیر معمولی مشاہدہ تھا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور مسکراہٹ کی جگہ آنسوؤں کی دو بڑھتی ہوئی دھاروں نے لے لی۔

حنیف جمنی کو اپنے گھر لے گیا اور دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ جمنی کے لیے حنیف کا گھر ایک نئی دنیا تھی۔ وہ پہلے صرف اپنے باپ اور حنیف کو جانتی تھی۔ عورت و مرد کا فرق تک اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اُسے کسی عورت سے سروکار نہ رہا تھا۔ یہاں اُسے بہتیری عورتوں سے واسطہ تھا۔ قبرستان کے ماحول کے لیے جمنی اپنے باپ کے ساتھ مر چکی تھی اور جس طرح اس کا باپ اس دنیا سے گذر کر ایک دوسرے عالم میں پہنچا ہوا تھا۔ جمنی بھی ایک عالم سے منتقل ہو کر دوسری دنیا میں بس رہی تھی۔ ہم اس زندگی میں بھی کتنی بار مر کر

جیتے ہیں۔ جوانی کا نمود بچپن کی موت سے ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آمد جوانی کے لیے پیامِ مرگ ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے۔ حنیف جمنی کو پروانہ وار چاہنے لگا۔ وہ اُس سے ایک منٹ کو علیحدہ ہونا گوارا نہ کرتا تھا۔ جمنی بھی حنیف کی عدم موجودگی میں بے قرار سی رہتی۔

ہمسایہ کا لڑکا شب کو مر گیا۔ جمنی کو صبح سویرے خبر ملی۔ وہ جلد جلد گھر کا کام کر کے ہمسایہ کے ہاں جانے لگی۔ وہ آج بہت خوش تھی، اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی دلکشی وجاذبیت کم ہو گئی تھی۔ حنیف اُس کی مسرت کا سبب نہ سمجھ سکا۔ جس وقت وہ ہمسایہ کے یہاں جا رہی تھی حنیف نے اس سے سوال کیا۔

"کیوں آج تم بہت خوش معلوم ہوتی ہو؟"

جمنی نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ حنیف کے دل و دماغ پر جمنی کی محبّت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ وہ جمنی کے سامنے کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ اس بے معنی تبسّم پر اس نے جمنی کے جانے کے بعد کوئی غور نہ کیا۔

جمنی ہمسایہ کے ہاں گئی تو بچّہ کی لاش کو اس وقت کفنایا جا رہا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس منظر سے لذت حاصل کر رہی تھی۔ برابر کی ایک عورت نے جمنی کی اس کیفیت کو دیکھ لیا۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ جمنی ان سبھوں میں بہت ہر دلعزیز تھی۔ اس کے خلاف کسی کو کسی طرح کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔

محلہ میں کوئی موت ہوتی تو جمنی وہاں ضرور پہنچتی اور دُور کھڑی ہو کر مسکراتی رہتی۔ اُس کی اس انوکھی مسرّت کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ اور محلّہ والیاں

اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں ۔ حنیف کو بھی اس کی بھنک ملتی رہتی ۔ وہ جمنی سے اس کی بابت سوال کرتا تو جمنی مخبوط و سراسیمہ سی ہو جاتی ۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بے گناہ پر جُرم کا الزام لگایا جا رہا ہے ۔ حنیف نے جمنی کو تاکید کر دی کہ وہ آئندہ کسی کی موت کی خبر سُن کر وہاں نہ جایا کرے ۔ جمنی نے اس کا وعدہ بھی کر لیا لیکن جب کبھی اُسے موت کی خبر ملتی اُس کے قدموں میں بجلی کی سی پھُرتی آجاتی اور وہ غیر ارادانہ گھر سے نکل جاتی ۔ حنیف کو جمنی سے کچھ خوف پیدا ہونے لگا تھا ۔

جمنی کا بچّہ تین دن سے بیمار تھا ۔ جمنی دن رات اس کی خدمت میں مصروف تھی ۔ ڈاکٹر نے نمونیہ تجویز کیا ۔ حنیف نے دوا کی دو شیشیاں جمنی کو لا کر دیں ایک کھانے کی اور دوسری سینہ پر مالش کرنے کی ۔ مالش کرنے والی دوا پر پوائزن کی چٹ لگی تھی ۔

" اس دوا کو الگ رکھنا اس میں زہر ہے ۔ " حنیف نے جمنی سے کہا جمنی نے دوا الگ طاق میں رکھ دی ۔ بچّہ کی حالت شام تک کچھ سنبھلنے لگی بخار میں کمی اور کھانسی میں تخفیف ہو گئی ۔ جمنی تین شب سے نہ سوئی تھی ۔ بچّہ کے پہلو میں بیٹھی سو گئی ۔

آدھی رات کو جمنی ایک خواب دیکھ رہی تھی ۔ وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑی ہے ۔ اس کا باپ قبرستان میں ہے ۔ سامنے سے کچھ لوگ ایک لاش کاندھے پر اٹھائے قبرستان کو جا رہے ہیں اور آپس میں گفتگو کر رہے ہیں ۔ " ایک عورت نے اس بے چارے کو زہر پلا دیا ۔ " جمنی یکا یک بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس کے چہرے پر موت کا سا پیلا پن تھا ۔ آنکھیں باہر کو نکلی آ رہی تھیں ۔ لبوں پر تھرتھراہٹ کے ساتھ ایک خوفناک مسکراہٹ تھی ۔ اس کے اعضا اکڑے ہوئے تھے ۔ اس کی مُردہ سی سخت ٹانگوں میں

یکایک جنبش پیدا ہوئی ۔ اس نے طاق کی طرف تیزی سے قدم بڑھایا اور زہر والی شیشی کو جھپٹ کر ہاتھ میں لے لیا ۔ اس کا چہرہ اور بھیانک ہوگیا ۔ موت کا فرشتہ اس کے جسم میں حلول کر گیا تھا ۔ شیشی مٹھی میں جکڑے وہ نہایت سرعت سے بچہ کے قریب آئی اور اس کے نازک جبڑے اپنے دونوں ہاتھوں سے کھول کر جن میں آہنی سلاخوں کی سی سختی آ گئی تھی ۔ شیشی کی ساری دوا بچہ کے منہ میں اُنڈیل دی ۔ اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بستر پر گر گئی ۔ وہ جلد ہی سو گئی ۔ کچھ دیر بعد بچہ کے کراہنے سے اس کی نیند ٹوٹی ۔ بچہ کرب و اذیت سے تڑپ رہا تھا ۔ آنکھیں پھرا رہی تھیں ۔ سارے جسم میں تشنج تھا ۔ بچہ کی حالت دیکھ کر جمنی نے اسے کلیجہ سے لگا لیا اور ڈاڑھیں مار کر رونے لگی ۔ حنیف قریب ہی سویا تھا اس کی نیند ٹوٹ گئی ۔ بچہ کی حالت ابتر تھی ۔ تھوڑی دیر میں وہ بے جان ہوگیا ۔ صبح کی روشنی میں حنیف کی نظر زہر کی خالی شیشی پر پڑی ۔ جو بچہ کے سرہانے پڑی تھی ۔

"تم نے بچہ کو دوا رات کس وقت دی تھی ؟" حنیف نے غضبناک ہو کر پوچھا ۔

"میں تو شام سے سوئی تھی ۔ اٹھی تو اس کی یہ حالت تھی ۔" جمنی نے سسکتے ہوئے کہا ۔

"پھر یہ خالی شیشی یہاں کہاں سے آئی ؟" حنیف نے شیشی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے پوچھا ۔

جمنی کی نظر شیشی پر پڑی ۔ اُسے خود حیرت تھی کہ اسے طاق میں سے کون لایا تھا ۔ جمنی کا استعجاب دیکھ کر حنیف کا سر چکرانے لگا ۔ اس کا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا ۔ زہر کی شیشی اس نے طاق میں رکھ دی اور بیہوش ہو کر بستر پر گر گیا ۔ صبح کو محلہ والیاں بچہ کی خیریت پوچھنے آئیں تو ایک طرف حنیف بستر پر پڑا تھا دوسری طرف جمنی غم سے چُور بچہ کو دیوانہ وار چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی ۔ بچہ کی موت پر

کسی کو تعجب نہ تھا۔ بچّہ کی حالت دن میں ہی غیر تھی۔ محلّہ والوں نے مل کر بچّہ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ حنیف کو ہوش نہ تھا۔ سبھوں نے سمجھا کہ پہلی چوٹ لگی ہے، غم سے چور ہو رہا ہے۔ بچّہ کی لاش جب قبرستان کو لے جانے لگے۔ تو جمنی یکبارگی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں جنازے پر لگی تھیں اور چہرے پر وہی پراسرار تبسّم تھا۔

حنیف بستر پر گرا تو پھر نہ اٹھا۔ جمنی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہیبت ناک دیوی کی صورت ہر وقت گھومتی رہتی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ جمنی اس کا گلا دبا رہی ہے۔ اور وہ یکبارگی چیخ اُٹھتا۔ جمنی کی بے معنی مسکراہٹ اس کے دل و دماغ میں چبھ رہی تھی۔ اس کے جسم میں خوف و ہراس سے شدّت کا لرزہ رہتا۔ اس کے حواس کسی وقت بجا نہ ہوتے تھے۔ اس کا بھائی اس کی بیماری کی خبر سُن کر آ گیا۔ اُس نے سارے جتن کر ڈالے لیکن حنیف کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ جمنی غم سے گھل کر آدھی ہو گئی تھی۔ آخر ایک دن، رات کے دو بجے حنیف کی حالت بالکل غیر ہو گئی۔ اُس کا بھائی سرھانے بیٹھا رو رہا تھا۔ جمنی الگ منھ چھپائے رو رہی تھی۔ حنیف کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ "جمنی ڈائن ہے۔ اس سے مجھ کو بچاؤ یہ مجھ کو کھا جائے گی۔ زہر اس نے زہر......" اتنا کہنے پر اس کی آواز بند ہو گئی۔ اور اُس کا بدن ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ حنیف کے بھائی نے اُس کے ہذیان پر اتنی توجہ نہ کی۔ وہ بچّوں کی طرح ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ صبح کو حنیف کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جانے لگے تو جمنی پر وہی غیر معمولی تبسّم کھیل رہا تھا۔ وہی ڈراؤنی ہنسی۔ موت کی دیوی کو اگر کبھی ہنسی آتی ہو گی تو اس کا تبسّم بھی ایسا ہی ہیبت ناک ہو گا۔ حنیف کے بھائی نے جمنی کی مسکراہٹ دیکھ لی۔ اس کا دماغ فوراً حنیف کے آخری الفاظ کی طرف منتقل ہو گیا۔ دفن سے واپس آیا تو اس نے جمنی کو بلا کر پوچھا۔ "مُردار! شوہر کی موت پر مسکراتی کیوں تھی؟"

جمنی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے سکوت اختیار کیا۔ حنیف کے

بھائی کو یقین ہو گیا کہ جمنی نے حنیف کو زہر دے دیا۔ خبر اُڑتی پڑتی تھانہ تک پہنچ گئی۔ پولس تفتیش کے لیے آ گئی۔ حنیف کے بھائی نے حنیف کا موت کے قبل کا بیان اور جنازہ کو دیکھ کر جمنی کا اظہار مسرّت یہ دونوں باتیں پولس کو بتا دیں۔ جمنی حراست میں لے لی گئی۔ مکان کی تلاشی ہوئی۔ طاق میں زہر کی خالی شیشی موجود تھی۔ پولیس کے نزدیک گمان و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

جمنی پر خون کا مقدمہ چلایا گیا۔ واقعاتِ متعلقہ جُرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

جمنی کو قید دوام کی سزا ہو گئی۔

جمنی اب تک قید خانہ میں زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ وہ بہت اداس و غم گین رہتی ہے۔ لیکن اب بھی جب اس کی نظر کسی قیدی کی میّت پر پڑ جاتی ہے تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے اور دیر تک دیوانہ وار ہنستی رہتی ہے۔

ساقی جولائی ۱۹۳۷ء

●

تعمیرِ جنوں

کالج میں اندرا سب سے حسین لڑکی شمار کی جاتی تھی، اس کے چہرہ کا اگر
تشریحی جائزہ لیا جاتا تو اس کا حسن کسی طرح غیر معمولی نہ معلوم ہوتا، لیکن اس کا مجموعی
اثر ایک خاص دل کشی و جاذبیت پیدا کرتا تھا جس سے کالج کی دوسری لڑکیاں
قطعاً محروم تھیں اور پھر اُس کی دلآویزی کا راز صرف اُس کی ظاہری صورت میں
نہ تھا۔ بلکہ اس کی سادہ بے بناوٹی فطرت بھی بڑی حد تک اس کی دل کشی کا موجب
تھی۔ اس کی بات چیت لباس و وضع طور طریقہ سے کسی طرح ظاہر نہ ہو سکتا تھا
کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ اپنے سب ساتھیوں سے ایک
طرح ملتی۔ ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے ملنے میں وہ کبھی اس سے زیادہ شرم
و حجاب کا اظہار نہ کرتی، جتنا کہ اس کی جنس کا فطری تقاضا ہوتا، لیکن ساتھ ہی وہ

کسی سے ملنے جُلنے میں اپنا نسوانی وقار بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ان خصوصیات نے اندرا کو کالج کے طلباء کا مرکزِ توجہ بنا دیا تھا۔ اندرا بھی سبھوں سے ملتی اور پھر کسی سے شیر وشکر بھی نہ ہوتی۔ لیکن دوسرے ساتھیوں کی بہ نسبت وہ شیام سندر کے ساتھ زیادہ آزاد تھی۔ اس کی وجہ صرف اتفاقی تھی۔ اندرا اور شیام سندر نے ایک ساتھ ایک اسکول میں تعلیم شروع کی، ساتھ ہی میٹرک پاس کیا، اور کالج میں بھی ساتھ تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایک ہی محلّے میں رہتے تھے اور ان کے والدین کے درمیان عرصہ سے کافی تعلقات تھے۔ غالباً اسی قدیم لگاؤ کے سبب شیام سندر اندرا سے اس طرح نہ ملتا تھا جس طرح اس کے دوسرے ساتھی ملتے تھے۔ وہ جب اندرا سے باتیں کرتے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جذبۂ شوق اپنی تکمیل کے لیے بے چین ہو رہا ہے لیکن یارائے اظہار نہ ہونے کی وجہ سے مجبور و بے بس کسی مناسب موقع کا منتظر ہے ان کی نگاہیں یوں تو دوسری طرف لگی ہوئی معلوم ہوتیں، لیکن آنکھیں بچا کر وہ کبھی کبھی اسے للچائی نظروں سے دیکھ لیتے، ان کے انداز میں مبالغہ آمیز متانت و سنجیدگی ہوتی، جو ان کی دلی کیفیات پر پردہ ڈالنے کے بجائے اس کی پردہ دری کرنے لگتی۔ وہ اندرا کو چاہتے تھے اور اپنے دلوں میں اس سے محبت کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ کامل احساس کے ساتھ ان کی ملاقات اندرا سے اس وقت شروع ہوئی تھی جب ان کا جذبۂ محبت اپنا بچپن ختم کر کے علم و پندار سے امتزاج حاصل کر چکا تھا، اور محبت کا مفہوم ان کے لیے صرف محبوب کی موجودگی میں انبساط و مسرت کے تاثرات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس میں محبوب کے حصول کی خواہش بھی شامل ہو چکی تھی، اس خواہش کا علم اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے غور و تفکر کی جولانی۔ اس کے برعکس شیام سندر کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا کہ اُسے اندرا سے محبت تھی۔ وہ بچپن سے ایک دوسرے سے ملتے جُلتے آرہے تھے اور آج بھی ان کے باہمی اختلاط میں اُسی معصومیت اور سادگی کا رنگ باقی تھا۔ گو ان کے دوسرے ساتھی ان کی راہ و

رسم میں اپنی کیفیات کا عکس دیکھ کر مختلف معنی بھر دیا کرتے تھے۔

اندرا آئی، اے، پاس کر کے بی۔ اے، میں داخل ہوئی، اس کے نئے ساتھیوں میں کان پور کے مشہور تاجر، بابو گوپال سرن کا بیٹا پرکاش بھی تھا جو بنارس ہندو یونیورسٹی سے آئی، اے پاس کر کے بی اے میں داخل ہوا تھا۔ پرکاش کا مردانہ حُسن اور تناسب اعضا بہت جلد اس کے ساتھیوں کا مرکز توجہ بن گیا۔ بنارس یونیورسٹی میں اس نے یونیورسٹی ڈیبیٹ میں اوّل ہونے کا انعام حاصل کیا تھا۔ سارے ساتھیوں کو اس کی تقریر سننے کا شوق تھا۔ "وہ جب اپنی اس مقناطیسی شخصیت کے ساتھ تقریر کرتا ہوگا تو ساری فضا سحر آگیں ہو جاتی ہوگی۔" وہ آپس میں گفتگو کرتے اور اس دن کے بے چینی سے منتظر تھے جب کالج ڈبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے سالانہ جلسہ میں پرکاش مباحثہ کی افتتاح کرنے والا تھا۔ آخر وہ دن آپہونچا۔ پرکاش نے مباحثہ شروع کیا۔ پرکاش کی جاذبیت اس وقت قابل رشک ہو رہی تھی، وہ صرف ایک حسین شخصیت کا حامل نہ تھا، بلکہ ایک بلند دماغ اور مسحور کر دینے والے الفاظ و بیان بھی اس کے حصّہ میں آئے تھے۔ ساری نگاہیں صرف اسی کو تک رہی تھیں۔ اندرا بھی ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہی تھی۔ "کتنا حسین مقرر ہے" اس نے دل میں سوچا اور نیم مدہوشی کی حالت میں پرکاش کی جادو بھری تقریر سُنتی رہی، تقریر ختم ہوئی تو اس کی تالیوں کی آواز دوسروں سے زیادہ بلند تھی۔ تالیاں بجاتے وقت وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑی بھی ہو گئی تھی۔

دوسرے دن اندرا شیام سندر سے بار بار پرکاش کی تعریف کر رہی تھی۔ شیام سندر خود بھی پرکاش کی شخصیت سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ وہ اندرا کی تائید کرتا جا رہا تھا۔ "کیوں نہ اُسے ہم اپنے ساتھ چائے پر مدعو کریں؟ ہم اس کی عالمانہ اور

پرُ از معلومات گفتگو سے ضرور فائدہ اُٹھا سکیں گے۔"

"کہاں؟"

"اپنے مکان پر"

"کیوں نہیں!" اندرا کی کالج کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنے گھر پر بلانے کا خیال ظاہر کر رہی تھی۔ شیام سندر کو اس کی اس خلاف وضع حرکت پر تعجب ضرور ہوا۔ "لیکن پرکاش کی شخصیت واقعی اس خصوصیت کی مستحق ہے۔" اس نے خیال کیا۔

"تو پھر پرکاش کو تم میری طرف سے مدعو کرو۔"

"کیوں تم اس سے خود کیوں نہیں کہتیں۔"

"تم ہی کہہ دوگے تو کیا ہوگا؟"

"میں تو اُسے مدعو نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو میں یہ تھوڑی ہی کہتی ہوں کہ تم اُسے مدعو کرو۔ صرف میری طرف سے اُسے کہہ دو مجھے خود کہتے ہوئے ذرا بے تکا سا معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن بے تکا پن تو زیادہ میرے کہنے میں ہے۔"

"تو تم نہیں کہو گے؟"

"میں تو نہیں کہتا۔ تمہارا اصرار ہے تو کہہ دوں گا۔"

شیام سندر کو اندرا کی یہ ضد کچھ انوکھی سی معلوم ہوئی۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے گفتگو کرنے میں بلا وجہ شرم و حجاب کی عادی نہ تھی۔ اور پھر اُسے پرکاش سے کچھ ایسی زیادہ باتیں بھی نہیں کرنی تھیں۔ صرف چائے پر بلانے کے لیے کہنے میں اُسے تامّل کیوں ہو رہا تھا؟ "وہ پرکاش سے زیادہ مرعوب ہو گئی ہے۔" اس نے دل میں سوچا اور پرکاش کو اندرا کی طرف سے مدعو کرنے کے لیے اس کے قریب جانے لگا۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ قدم آگے بڑھانے میں اسے کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔ جیسے وہ کسی دشوار مہم پر جا رہا ہو۔

"اندرا نے تمہیں اپنے یہاں چاء پر بلایا ہے۔" اس نے پرکاش کے قریب پہونچتے ہی تیزی سے یہ الفاظ کہہ ڈالے۔ جیسے وہ کسی زبانی یاد کئے ہوئے جملہ کو دہرا رہا ہو۔

"یعنی؟ مجھ کو؟ کب؟" پرکاش نے شیام سندر کے انداز گفتگو سے متحیر ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"آج شام کو۔" شیام سندر نے جواب دیا۔ وہ اپنی گفتگو کا بے تکا پن محسوس کرکے شرما گیا۔ "اندرا نے مجھ سے بے موقع یہ کام لیا۔ اسے خود پرکاش سے کہنا چاہئے تھا۔" اس نے خیال کیا۔

"اور کون ہوگا؟"

"ہم تم اور اندرا۔"

"اچھی بات ہے مجھے کوئی عذر نہیں۔"

اندرا پرکاش کی دعوت کے انتظام میں منہمک تھی۔ شیام سندر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اندرا کا انہماک اس پر ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کر رہا تھا، جس کی تشریح خود اس کا دماغ نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کسی خوف کا اتنا ہلکا احساس کہ اسے کسی دوسرے جذبہ سے تمیز کرنا مشکل ہو۔ رہ رہ کر اس کے دماغ میں وہاں سے چلے جانے کی ایک مبہم سی خواہش پیدا ہوتی لیکن اس خواہش کو قرار حاصل نہ ہوتا۔ وہ اپنے اندر ایک اضطراب آگیں کیفیت کا عمل محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ پر ایک طرب ناک انتظار کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ اس کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ جس کا سبب سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔

پرکاش وقت مقررہ پر اندرا کے مکان پر پہونچ گیا اور تینوں ایک ٹیبل کے تین طرف بیٹھ گئے۔

"آپ نے اتنا تکلف ناحق کیا۔ اس قسم کی صحبتیں کھانے پینے کی غرض سے

تھوڑی ہی ہوتی ہیں کہ ان کے لیے اتنا اہتمام کیا جائے ۔"

"نہیں کوئی خاص تکلف تو نہیں ہے ۔" اندرا نے کیک کی رکابی پرکاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مختلف قسم کی باتیں ہونے لگیں ۔ زیادہ گفتگو پرکاش کر رہا تھا۔ شیام سندر اور اندرا خموشی سے سُن رہے تھے ۔ گفتگو کا موضوع موجودہ ادبی رجحان ۔ سائنس کی کرشمہ سازیاں، ہندوستان کا مستقبل، دُنیا کا مذہب، ان سبھوں سے بدلتا ہوا سائیکو انیلسس (نفسیات تحلیلی) پر آپہونچا تھا۔

"سائیکو انیلسس (نفسیات تحلیلی) نے ہمارے سامنے ایک نئی دنیا پیش کردی ہے جس کی وسعتیں بھی بے پناہ ہیں اور گہرائیاں بھی اتھاہ ۔ یُنگ (JUNG) نے تو اپنے کلکٹو انکونشنس (لاشعور ذہن اجتماعی) کو منازل حیات کے سارے تجربات و مشاہدات کا مکمل ریکارڈ قرار دے رکھا ہے ۔ گویا ہمارے روزمرہ کے کردار صرف اُنہیں جذبات و محرکات سے متاثر نہیں ہوتے جن کی بنیاد ہماری انفرادی زندگی میں پڑتی ہے بلکہ اُن سارے ترغیبات و رجحانات سے جو ابتدائے آفرینش سے نسلاً بعد نسلٍ ہماری وراثت میں آتی جا رہی ہیں اور جن کا مخزن ہمارا ذہن لاشعوری ہے ۔

واقعی یہ نظریہ نہایت صحیح ہے ورنہ ہم باوجود اتنے متمدّن ہو چکنے کے اکثر حالات میں اُن حرکتوں کے کیوں مرتکب ہو جاتے ہیں ۔ جنھیں دیکھ کر ایک غیر متمدّن قوم بھی شرما جائے ؟ آپ اسپین کی سول وار کو دیکھیے کیا اس کے اندر وہی خون آشامی و غارت گری کا وحشیانہ جذبۂ عمل پیرا نہیں ہے جو ہمارے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے آباد اجداد کی روزمرّہ زندگی کا جزو لاینفک تھا ؟ کیا اسپین کا کوئی ذی فہم باشندہ اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کی خون کی ندیاں بہانا بے گناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو تہ تیغ اور بے خانماں کر دینا ان خوب صورت شہروں اور دل کش عمارتوں کو جن کے کمالِ صنعت پر وہ دنیا کے سامنے فخر کیا کرتا تھا اس طرح

اپنے ہی ہاتھوں سے ویران و برباد کر دینا انسانی اُولوالعزمی و سربلندی فرزانگی وسعت نظری کی ہنسی اُڑاتا ہے؟ وہ اگر تنہائی میں بیٹھ کر اپنی حرکتوں کا جائزہ لے تو کیا سب سے پہلے اپنے آپ کو گولی مار دینے کے قابل نہ تصور کرے؟ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ذہن اجتماعی (COLLECTIVE MIND) جس کے وجود و نشو و نما کا راز حیات کی مکمل تاریخ میں ملتا ہے اس پر مسلّط ہے اور اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت نہیں دیتا۔"

پرکاش اپنی گفتگو میں منہمک تھا۔ اندرا نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی جیسے وہ گفتگو سے زیادہ کھانے کی چیزوں سے دلچسپی لے رہی ہو۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پرکاش پر ڈال لیا کرتی تھی۔ شیام سندر اندرا کے انداز میں ایک انوکھا پن محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں اُسے اپنے ان ساتھیوں کی نظروں کی جھلک دکھلائی دے رہی تھی جنھیں اندرا کی محبت کا دعویٰ تھا۔ ویسی ہی چرائی ہوئی سی نگاہیں۔ وہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطے مارنے لگا۔ "اندرا پرکاش کو چاہنے لگی ہے۔" اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُس کے کان میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ "تو پھر اس میں حرج ہی کیا ہے؟" جیسے اُس نے ان الفاظ کا جواب دیا۔ کیا پرکاش اندرا کی محبت کا حقیقی معنی میں اہل نہیں ہے؟" لیکن پھر اس کے دماغ میں خوف کا سا دھندلا پن کیوں پھیل گیا؟ "اندرا اسے اس کی راہ و رسم ختم ہو جائے گی۔" اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے دماغ پر ٹھوکروں سے یہ آواز پیدا ہوئی۔ "کیوں؟ ایسا کیوں ہونے لگا پرکاش سے اُس کی دوستی کچھ کم نہیں ہے وہ اس کے بعد بھی اندرا سے اسی طرح مل جل سکتا ہے۔" "کس کے بعد؟" جیسے کسی نے اُس سے اس جملہ کی توجیہہ کی فرمائش کی "اندرا کی پرکاش سے شادی کے بعد۔ کیا یہ ایک بہترین جوڑا نہ ہوگا ان دونوں کے ملاپ پر خود فطرت اپنی حسن آفرینی و موزونیت پر ناز کرے گی۔" "لیکن وہ کیا کرے گا؟" یہ سوال اُسے بالکل بے معنی سا معلوم ہوا۔" وہ اندرا اور پرکاش سے اپنی

دوستی اور مضبوط کر کے ان کی صحبتوں سے ویسے ہی لطف اندوز ہوتا رہے گا۔"

شیام سندر کا دماغ ایک مستقل مکالمہ کا سین بنا ہوا تھا۔ پرکاش کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔" آپ اگر اپنے روزمرہ کے کردار کا صحیح جائزہ لیں تو بیشتر حالات میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کا ارادہ کچھ اور ہے۔ اور آپ کا عمل کچھ اور۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے عمل و کردار کی کوئی غرض و غایت نہیں گو آپ انہیں بروئے کار لانے پر مجبور ہیں۔ انسانی قوت ارادی کا استحکام آپ کو بالکل متزلزل معلوم ہوگا، اور اس کی آزادی قطعاً بے معنی۔ میں اس احسان کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں جو علمائے نفسیات نے انسانیت پر ......"

دفعتاً چائے کی پیالی جو شیام سندر کے لبوں سے قریب ہو رہی تھی اس کے مرتعش ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور میز پر چائے دانی سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی چائے کی چھینٹیں تینوں کے کپڑوں پر گریں۔ اندرا اور پرکاش یکبارگی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیام سندر کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ جیسے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو، اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔" میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں گھر جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے علیحدہ ہونے لگا۔

اندرا گھبرا گئی۔ پرکاش پر بھی حیرت و استعجاب طاری ہو گیا۔

" شیام! تمہیں یہ یک بیک کیا ہو گیا۔ گھبراؤ نہیں۔ بیٹھ جاؤ، گھر جا کر کیا کرو گے۔ فوراً طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اندرا نے شیام سندر کے قریب آ کر کہا۔

" میں خود نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اندرا مجھے اب یہاں ٹھہرنے نہ دو۔ میرا سر بُری طرح گھوم رہا ہے۔ میں ایک منٹ بیٹھ نہیں سکتا۔ پرکاش مجھے سخت ندامت ہے کہ میری وجہ سے یہ دل چسپ صحبت بے لطف ہو گئی۔ تم مجھے معاف کرو گے۔"

"توبہ! کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں تو کہتا ہوں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ، طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"نہیں مجھے جانا ہی چاہیے۔" کیوں؟ اس کا سبب خود شیام سندر کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندرا کے مکان سے باہر نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے دماغ کا توازن قائم ہو گیا تھا اور اس کے خیالات کا دھندلا پن مفقود اب وہ ہر بات صحیح طور سے سوچ سکتا تھا۔ "توبہ کتنی لطیف صحبت آج میری وجہ سے گرکری ہو گئی۔ نہ جانے مجھے یک بیک کیا ہو گیا تھا۔ پرکاش جانے کیا سمجھتا ہوگا۔ مگر وہ ان سطحی باتوں سے بہت بلند ہے اُسے اتنی اتنی باتوں کا خیال نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک قابل قدر شخص ہے۔ کتنا خوب صورت کتنا ذی علم اور ساتھ ہی کتنا عمدہ انسان۔ خدا کرے وہ بھی اندرا کو پسند کرے اور دونوں کی شادی ہو جائے۔" دل میں اس طرح باتیں کرتا شیام سندر گھر آ کر کرسی پر دراز ہو گیا اور دیر تک اسی طرح مختلف خیالات میں اُلجھتا سو گیا۔

شیام سندر دن بدن اپنی دوستی پرکاش سے بڑھا رہا تھا۔ وہ پرکاش کی عدیم المثال شخصیت کی پرستش کرنے لگا تھا۔ پرکاش اس کی اس عقیدت مندی کا جواب اس خلوص و محبت سے دے رہا تھا جو اس کی اعلیٰ شخصیت کی متقاضی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے قلوب میں ایک مستقل رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کے اثر سے ایک کی کیفیات کا صحیح عکس دوسرے پر پڑ جاتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ذہن و شعور کے عمل میں بھی ایسی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ سوچنے یا سمجھنے سے معذور ہو رہے تھے۔

کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے نائب صدر کا سالانہ انتخاب نزدیک تھا۔ شیام سندر نے پرکاش کو اُمیدوار بننے کے لیے آمادہ کیا۔ پرکاش اپنی

جانب سے اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے دماغ میں ایسے ایسے اعتراضوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن شیام سندر کی خاطر اسے منظور تھی، مگر اس وعدہ کے ساتھ کہ وہ کسی کے سامنے بھی اپنے لیے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے زبان نہ کھولے گا۔ ساری کنویسنگ شیام سندر کو کرنی تھی۔ شیام سندر اس کے لیے آمادہ تھا۔ اپنے اعلیٰ کیرکٹر کی وجہ سے اُس کے ساتھیوں میں اس کا خاصا اثر تھا۔ اسے یقین تھا کہ پرکاش کی بلند صلاحیتیں اور اس کی کوشش ان دونوں کی موجودگی کے بعد کسی اُمیدوار کا پرکاش کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دشوار تھا۔

پرکاش کے مقابلہ میں چندربنسی، جو پرکاش کے کالج میں داخلہ کے قبل تک کالج کا سب سے اچھا مقرر سمجھا جاتا، پرکاش کے خلاف پروپگنڈہ کر رہا تھا۔ اِدھر شیام سندر بھی پرکاش کے لیئے زوردار کنویسنگ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی ذات پرکاش کی شخصیت میں مدغم کر دی تھی اور اس میں اور پرکاش میں کوئی فرق باقی نہ تھا۔ اپنی کامیابی کے لیے بھی اس سے زیادہ کوشش نہ کر سکتا تھا۔

الکشن کے دن شیام سندر بستر سے بہت سویرا اُٹھ گیا۔ وہ عموماً اتنا سویرا اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔ لیکن اس دن اسے پرکاش کے کام سے باہر جانا تھا، جس کی اہمیت اس کے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ اس نے اب تک باہر کے درمیان کنویسنگ کی تھی آج اسے ہوسٹلوں میں ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے جانا تھا۔ الکشن ۳ بجے شام کو ہونے والا تھا۔ وہ اس وقت تک اپنا وقت وہیں گذارنے والا تھا۔ اس نے صبح کی ضرورتوں سے جلد فراغت حاصل کرلی اور سائیکل لے کر گھر سے باہر جانے لگا۔

"اس کی بریک ڈھیلی ہوگئی ہے، دُرست کرا لیجیےگا۔" اس کے چھوٹے بھائی نے اس سے کہا۔

لیکن اس نے صرف الفاظ سُنے۔ ان کے مطلب کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہوا جیسے وہ کسی غیر زبان کے الفاظ تھے۔ اور سائیکل لے کر گھر سے روانہ ہوگیا۔

وہ تیزی سے سائیکل چلائے جا رہا تھا۔ ایک ٹم ٹم اس کی طرف آ رہی تھی۔ سڑک وہاں پر تنگ تھی، پھر بھی وہ ٹم ٹم کے بغل سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ لیکن اس نے یکبارگی سائیکل کا رُخ اپنے بائیں جانب پھیر دیا جیسے کوئی نوآموز سائیکل باز جسے گھبراہٹ میں اپنے دماغ پر قابو نہیں رہتا۔ سڑک کے کنارہ سے میونسپلٹی کا نالہ بہتا تھا، سائیکل کی بریک ڈھیلی تھی۔ سائیکل نالہ کے اندر جا گری۔ شیام سندر کے سر میں شدید چوٹ آئی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی آنکھیں کُھلیں تو اس نے اپنے کو اسپتال میں ایک بستر پہ پڑا پایا۔ اس کے سر میں بینڈج بندھا ہوا تھا اور اس کے جسم پر جا بجا مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ وہ اپنی اس حالت کا جائزہ لے کر افسردہ ہو رہا تھا۔ گھڑی نے شام کے پانچ بجائے اور اس کا خیال دفعتاً پرکاش کے الکشن کی طرف منتقل ہوگیا۔

”الکشن ختم ہوگیا ہوگا، جانے پرکاش کا کیا ہوا ہوگا۔“ اس نے سوچا لیکن اس خیال سے جو اضطراب و ہزیمت کی کیفیت اس پر پیدا ہونی چاہیے تھی نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا قلب مطمئن تھا۔ گو اس طمانیت پر استعجاب و حیرت کی کیفیت غالب تھی۔ اس اچانک حادثہ کا کوئی معقول سبب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ”وہ کافی مشّاق سائیکلسٹ تھا۔ پھر اُسے ہو کیا گیا تھا؟ اس نے بریک کی مرمّت کیوں نہ کرائی جب کہ اس کے بھائی نے اسے مطلع کر دیا تھا۔“ اُسے اپنی اس حماقت پر غصّہ آنے لگا۔

پرکاش کو الکشن میں ناکامیابی ہوگئی۔ پرکاش کو اپنی ناکامیابی کا صدمہ ضرور ہوا، لیکن اس کا احساس اس استعجاب میں کھو گیا۔ جو شیام سندر کے کالج نہ آنے پر اسے ہو رہا تھا۔ الکشن ختم ہوتے ہی وہ سیدھا اندرا کے پاس آیا اور دونوں شیام سندر کے گھر پہونچے۔ شیام سندر کا وہاں کوئی پتہ نہ تھا۔ اِدھر اُدھر تلاش کرتے وہ آخر ہسپتال گئے۔ اس وقت شیام سندر کو ہوش میں آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کے چہرہ پر غایت اضمحلال اور پراگندگی کے آثار دیکھے، اور

ڈاکٹر سے مل کر اس کی صحت یابی کے یقین کا اطمینان کر کے اُسے آرام کرنے کے لیے چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ اس کمرہ کی نرس کو تعجب ہو رہا تھا۔ شیام سندر اس سے پہلے کافی بشاش نظر آ رہا تھا" اس نوجوان حسینہ کو دیکھ کر اس کے چہرہ کی رنگت کیوں پھیکی پڑ گئی اُسے تو زیادہ خوش نظر آنا چاہیے تھا" وہ ایک نہایت ذہین عورت تھی جو مردوں کی ہوسناکیوں کے آگے اپنا سب سے بیش قیمت جوہر قربان کر کے ان کی نفسیات کا حقیقی مطالعہ کر رہی تھی، اور اس طرح ایک مرد کے چہرہ کی رنگت میں وہ کچھ دیکھ سکتی تھی جو دوسروں کو مشکل سے نظر آ سکتا تھا۔ پھر شیام سندر کی یہ غیر معمولی کیفیت اسے متعجب کیے بغیر کیوں کر رہ سکتی تھی۔

شیام سندر اسپتال سے بہت جلد صحت یاب ہو کر واپس آ گیا۔ اور اس کی زندگی کالج کی مصروفیتوں میں حسب دستور گذرنے لگی۔ کتابوں کی طرف اس کی توجہ پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ "میں نے اب تک اپنے ساتھیوں میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی ہے۔ لیکن بی۔ اے کے امتحان میں ضرور اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوں گا۔" وہ اکثر سوچا کرتا اور آنے والے امتحان کی تیاری میں اور زیادہ مصروف ہو جاتا۔ بی۔ اے کے امتحان میں اُس نے تواریخ میں اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی پرکاش یونیورسٹی میں اوّل رہا۔ اور اندرا کو بھی شاندار کامیابی ہوئی۔

پرکاش اور اندرا کے تعلقات اب اس منزل پر آ پہونچے تھے۔ جب محبت تمثیلی (IDEAL) حدود سے گذر کر اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور جذبہ حصول و مفوضت کا صرف ایک رومانی نام بن کر رہ جاتی ہے۔ پرکاش اور اندرا کے تعلقات کی خبر اندرا کے باپ کو بھی ہو چکی تھی۔ وہ بہت جلد اس رشتہ کو قوی کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں طرف سے بات پختہ ہو گئی، اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی، اندرا کے باپ نے شادی کا سارا انتظام شیام سندر کو سونپ دیا۔

شیام سندر نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ شادی کے ایک ہفتہ پہلے سے وہ اندرا کے مکان پر مستقل طور پر منتقل ہو جانے والا تھا، تاکہ سارے انتظام کی پوری نگہداشت کر سکے۔

اندرا کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ شیام سندر شب کے ۱۰ بجے اندرا کے باپ سے دوسرے دن سے مستقل آکر رہنے کا وعدہ کر کے گھر واپس آیا اور آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ دن کے کام سے وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ اُسے بہت جلد نیند آگئی۔ رات کے دو بجے وہ یکایک ایک بھیانک خواب سے چونک گیا۔ اس کی گود میں ایک لمبے بالوں والی گلدار بلّی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کھیل رہا تھا۔ یکایک اسے ایک عجیب صورت دکھائی دی، جس کے جسم کا آدھا حصّہ نہایت خوبصورت اور دل کش تھا۔ لیکن آدھا حد سے زیادہ کریہہ اور ڈراؤنا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دو متضاد صورتوں کو الگ الگ بیچ سے سیدھا کاٹ کر دونوں کا نصف جوڑ کر ایک کر دیا گیا ہو یہ حیرت انگیز شکل تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی شیام سندر کے قریب آئی اور بلّی کو اس کی گود سے چھین کر اُسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ شیام سندر کے جسم سے مزاحمت کی قوت غائب ہوگئی تھی وہ چیخنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز بند ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ بلّی اس عجیب شخصیت کے سینہ سے چمٹی ہوئی اس کے خوب صورت گال کو چومنے لگی۔ بلّی کو اپنے قبضہ میں کر کے وہ تیزی سے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے سے فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ وہ سارے عالم پر ظلم و ستم ڈھاتا جا رہا تھا۔ اسی شور و ہنگامہ سے شیام سندر کی نیند ٹوٹ گئی۔

باہر ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ کھڑکی کے پٹ زور زور سے ٹکرا رہے تھے، تیز و تند ہوا مختلف قسم کی سیٹیاں اور آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ شیام سندر نے اُٹھ کر کھڑکی کے

سارے کواڑ بند کر دیئے اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔ وہ اپنے سر میں بھاری پن محسوس کر رہا تھا اور اعضا میں درد۔ اس کے قلب کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ "کتنا ہیبت ناک خواب تھا۔" اس نے سوچا اور سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اُسے نیند نہ آئی، صبح ہوتے ہوتے اس کے سر کا بوجھ اور اعضا کا درد تیز ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے بخار چڑھ رہا ہے۔ اُس نے چاہا کہ اسی حالت میں اندرا کے گھر چلا جائے لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے جسم کی طاقت کسی نے یکبارگی سلب کر لی تھی۔ اور وہ بستر سے اُٹھ تک نہ سکتا تھا۔

شیام سندر ایک ہفتہ سے زیادہ بیمار پڑا رہا۔ اسے تھوڑا تھوڑا بخار رہتا، سر میں شدّت کا درد اور اعضا میں اضمحلال جس کے سبب سے وہ نقل و حرکت سے قاصر ہو رہا تھا۔ لیکن باوجود اس بیماری و تکلیف کے اس کے چہرہ پر کوئی پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار نہ ملتے تھے۔ جیسے وہ اس عارضہ کو کوئی اہمیت نہ دے رہا تھا۔ گو اُس کی بیماری اُس کے معالج کے دماغ میں اُلجھنیں پیدا کرنے کو کافی تھی ——— اُس کی علامتیں اس کی پڑھی ہوئی کتابوں کے وضع کردہ اقسام مرض سے موافقت نہ کرتی تھیں۔ وہ کبھی اس کی بیماری کو انفلوئنزا کہتا، کبھی میعادی بخار، کبھی اس کے دماغ میں ٹی۔ بی کا شبہ ہوتا، کبھی گٹھیا کا۔ اس طرح وہ روزانہ اپنے فیصلہ میں ترمیم کی گنجائش محسوس کر کے نسخہ میں اسی مناسبت سے تبدیلیاں واقع کر دیتا۔ لیکن شیام سندر کو کوئی افاقہ نہ معلوم ہوتا۔ چنانچہ اُسی کی بیماری ہی کی حالت میں پرکاش بارات لے کر آیا اور اندرا کو اپنے ساتھ کان پور لے گیا۔ شیام سندر اندرا کے بیاہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس روز دن بھر اسے اُس کا صدمہ رہا۔ اندرا اور وہ ساتھ کے کھیلے تھے۔ دوسرے دن سے اُسے یک بیک افاقہ ہونا شروع ہو گیا۔ اور وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔

شیام سندر نے بی۔ اے کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ اُس کے دل میں ایک کامیاب وکیل بننے کی خواہش تھی اُس نے اس خواہش کی تکمیل میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی، وہ بہت جلد ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔ اندرا اور پرکاش سے اس کی دوستی جاری تھی۔ بلکہ اُس کے ملاقاتیوں میں یہی دونوں تھے جن سے وہ حقیقی معنی میں خلوص اور محبت رکھتا تھا۔

پرکاش اور اندرا دُنیا سے قطعاً بے نیاز فردوسی زندگی گزار رہے تھے۔ کاروبار کا انتظام سارا پرکاش کا باپ کرتا۔ پرکاش قطعاً آزاد تھا۔ اُس کے اوقات کتب بینی یا مختلف ممالک کی سیر میں گزرتے، اندرا بھی باپ کے مرنے کے بعد سے اپنے آبائی گھر سے بالکل بے تعلق ہو چکی تھی۔ لیکن ان کی یہ سکون پرور زندگی فطرت کے دستور کے خلاف تھی۔ فطرت سکون نہیں پسند کرتی وہ خود ہر ساعت مضطرب اور بے چین رہتی ہے۔ اور حیات کو اضطراب و ہنگامہ کی شراب سے سرشاری بخشتی رہتی ہے۔ زندگی کے ساز میں بلا زیر و بم کے نغمہ کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؟ پرکاش زندگی کے مضراب کو، اس کی ٹھوکروں کو، کمزور و ناکارہ بنا رہا تھا۔ زندگی کے ساتھ اس کا یہ سلوک فطرت کی برداشت سے باہر تھا وہ اس سے اس کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کا باپ دفعتاً قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ پرکاش اندرا کے ساتھ کشمیر میں تھا۔ اُسے یکایک تار ملا اور آدم و حوّا کی جنت سے نکالے جانے کی داستان حیات کے صفحہ پر دوبارہ مرتسم ہو گئی۔

پرکاش کے سر پر ایک ناگہانی عذاب نازل ہو گیا۔ سارے کاروبار کا بوجھ اسے تنہا سنبھالنا تھا۔ وہ اس کام سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ اس کی ناتجربہ کاری دوسروں کی کامگاری کا ذریعہ بن گئی۔ کارخانہ کے ملازموں نے حرام خوری شروع کر دی۔ الہ آباد کے ایک بڑے دکاندار نے جو اس کے کارخانہ سے برابر مال خرید اکرتا تھا، اس کے ملازموں کو ملا کر اُس پر کئی لاکھ کی نالش کر دی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ رقم کارخانہ کو بہ طور

پیشگی قیمت مال ادا کی گئی تھی لیکن اس کے عوض مال وصول نہ ہوا تھا۔ اس نے جعلی کاغذات مقدمہ کی حمایت میں تیار کر لیے، اور پرکاش کے ملازموں کو رشوت دے کر اپنے حسب خواہ گواہی کے لیے آمادہ کر لیا۔

پرکاش نے مقدمہ کی پوری کارروائی شیام سندر کے حوالے کر دی اور خود مطمئن ہو کر کارخانہ کے دوسرے معاملات کی درستی میں مصروف ہو گیا۔ شیام سندر نے پرکاش کے مقدمہ میں آن تھک محنت اور کوشش سے کام کیا۔ شاید اپنے خاص کام کو بھی وہ اتنی توجہ نہ دیتا اسے کامل یقین تھا کہ مقدمہ پرکاش کے حق میں فیصلہ ہو کر رہے گا۔ مقدمہ کی سماعت کے دن وہ پوری طرح تیار ہو کر کچہری پہونچا اور مخالف وکیل کی جرح کے جواب میں بحث کرنے کو کھڑا ہوا۔ وہ اپنی خداداد قانونی قابلیت کا سکہ جما چکا تھا اس دن اس کی بحث سننے کے لیے وکلا کثیر تعداد میں جمع تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ پرکاش سے گہرے تعلقات کی بنا پر وہ پرکاش کے مقدمہ میں اپنی ساری قانونی صلاحیت کو بروئے کار لائے گا۔ لیکن وہ بہت جلد حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ شیام سندر اس وکیل کی طرح بحث کر رہا تھا، جس نے پہلی دفعہ کچہری میں قدم رکھا ہو اور اپنی گھبراہٹ اور سراسیمگی پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں طفل مکتب کی طرح اصل مطلب سے دور بھٹکتا جا رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مخالف وکیل اسے ہپناٹائز کر کے اس کے منہ سے اپنے حسب مرضی باتیں کہلوا رہا تھا۔ ایسی خام بحث کا نتیجہ ظاہر تھا۔ پرکاش مقدمہ ہار گیا۔ اور اسے ایک سال کی سزا ہو گئی۔

بحث ختم کرتے ہی شیام سندر سیدھا گھر واپس آیا۔ وہ اپنے اندر ایک مجنونانہ کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے باوجود اتنی سخت ناکامیابی کے ایک گہری لذت اور طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل و دماغ سے کسی نے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا ہو۔ وہ اپنے دماغ کی اس کیفیت کا مفہوم جاننا چاہتا تھا

اس نے پرکاش کی زندگی خاک میں ملا دی۔ آخر کیوں؟ وہ اس کا عزیز ترین دوست تھا۔ جس کی صحبت کا ایک ایک لمحہ اُسے اپنی ساری کمائی سے زیادہ قیمتی تھا پھر وہ اُس کی بربادی کا سبب کیوں بنا؟ وہ اپنے دماغ سے ان سوالوں کا جواب مانگ رہا تھا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"بتاؤ مجھ کو بتاؤ" ۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ "مجھ کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میرا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ ہاں ہاں! میں پاگل ہوں۔ دیوانہ جسے اپنی حرکات وسکنات پر کوئی قابو نہیں رہتا۔ پھر میری باتوں پر نکتہ چینی خود پاگل پن ہے۔ لیکن نہیں! میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل کیوں ہونے لگا؟ مگر مجھ کو کیا ہوگیا ہے؟ پرکاش تم بتاؤ۔ مَیں اندرا سے پوچھوں گا! اپنی اندرا سے اندرا صرف میری ہے۔ پرکاش کی نہیں۔ پرکاش! چور! بدمعاش! فریبی دغاباز! میں تجھے زندہ نہ چھوڑوں گا۔" اُس نے اپنے کپڑے نوچ ڈالے اور پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا گھر سے نکل گیا۔

وہ اب تک شہر شہر بڑبڑاتا پھرتا ہے۔ اُس کی باتیں بے ربط ہیں، لیکن اُس کے ہر مہمل اور بے معنی جملہ کے ساتھ یہ ٹکڑا ضرور شامل رہتا ہے۔ "بدمعاش فریبی، مکار! میں تجھے کبھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

ساقی جنوری ۱۹۳۸ء

زہری

ٹالی گنج کی سنسان سڑک پر رمزو اپنے خیالات میں کھویا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی زندگی بالکل بے کیف گذر رہی تھی۔ فیکٹری کی مشینوں کی طرح جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اس کی ہر صبح ایک طرح کی ہوتی۔ جب وہ بستر سے اٹھتے ہی ہاتھ منہ دھوکر جمائی کے ہوٹل میں دو بسکٹ اور ایک پیالی چاء پی کر فیکٹری چلا جایا کرتا تھا اور ہر شام ویسی ہی بے رونق۔ جب وہ روزانہ اسی رستہ سے اسی وقت ویسے ہی خیالات میں گم اپنی بوسیدہ کوٹھری کو واپس ہوتا تھا۔ پچھلے دنوں کی یاد اس کی اس میکانکی زندگی میں کبھی کبھی مدھم کیفتیں پیدا کر دیتی تھی۔ شاید وہ انھیں کے سہارے جی رہا تھا۔ اُن دنوں وہ اپنے گاؤں میں رہتا تھا۔ کھیت پر اسے فیکٹری سے کم محنت نہ کرنی ہوتی تھی۔ جیٹھ کی دوپہر کی جھلستی ہوئی کرنیں اور

جاڑے کی صبح کی برفانی ہوائیں اس کے ننگے جسم کو کام کی تھکاوٹ سے زیادہ مضمحل اور خستہ کر دیتی تھیں۔ لیکن اس وقت اس کی زندگی کا عمل کھیت کی کاوشوں تک محدود نہ تھا۔ ہر شام بیوی بچوں کے درمیان اس کی زندگی میں ایک نیا اُبھار پیدا ہوتا تھا۔ ہر صبح وہ ایک نیا جنم لے کر بیدار ہوتا تھا۔ اس کی ننھی بچی، جو اب خود کئی بچوں کی ماں ہو کر اس سے الگ اپنی سسرال میں بس رہی تھی، اپنی بھولی بھالی صورت اور تُتلی زبان سے اُسے ہر وقت سرمایۂ حیات بخشا کرتی تھی۔ وہ ہر شام فیکٹری سے لوٹتے ہوئے اس کی بھولی بسری صورت اور بچپن کی باتیں یاد کر کے کچھ دیر کو اپنے ماحول سے کھو جایا کرتا تھا۔ وہ اِس وقت بھی تصوّر میں اس کے قریب پہونچ گیا تھا۔ ننھی بچی اس کی آنکھیں اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے ڈھانکے اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی "کتنی پیاری اور کیسی شریر بچّی تھی"۔ یکایک ایک بچّی کی جگر خراش چیخ نے اُسے پھر اپنے ماحول سے باخبر کر دیا۔ وہ سڑک کے کنارے لیمپ کے کھمبے سے لگی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ رمزو اضطراری طور پر اس کے قریب پہونچ گیا۔ اور اس کے آنسو اپنے کُرتہ کے دامن سے پونچھنے لگا۔

"میرے باپ کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ لوری پر چڑھنے لگی تو انھوں نے مجھے دھکّے دے کر نکال دیا۔" زہری یہ کہہ کر پھر رونے لگی۔ رمزو کا دل دردِ محبّت سے اُمڈا آ رہا تھا۔ برسوں کے بعد ایک بچّی اسے اپنی فریاد سُنا رہی تھی۔ اس نے اُسے تسلّیاں دیں اور گود میں اُٹھا کر اپنی کوٹھری میں لے گیا۔

زہری باپ کے جیل خانہ جانے کے بعد سے اس دنیا میں اکیلی تھی۔ وہ دن بھر رمزو کا انتظار کرتی اور جب رمزو شام کو فیکٹری سے واپس آتا تو پھر وہ اپنے باپ کے قصّے اس کے آگے دہرایا کرتی۔ رمزو کی تاریک زندگی کو چیرتی ہوئی روشنی کی ایک لہر دوڑنے لگی! رمزو کی ماضی میں کھوئی ہوئی بچّی اُسے واپس

مل گئی تھی۔ رمزو اب صرف مشین کے پرزوں کی طرح حرکت نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نے
پھر جینا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا دائرہ فیکٹری کی حدوں سے زیادہ
وسیع ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ محنت سے کام کرتا تھا تاکہ اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ
ہو جائے تو وہ زہری کی شادی کے لیے کچھ پس ماندہ کر سکے۔ وہ زہری کی شادی
اپنے حوصلہ سے کرنا چاہتا تھا۔ اُسے دان جہیز بھی جی بھر کے دینے والا تھا۔

عام کساد بازاری نے سارے کاروبار ماند کر دیئے تھے۔ کتنی فیکٹریاں بند
ہو گئیں کتنے آدمی بے روزگار ہو گئے۔ انھیں میں رمزو بھی تھا۔ اس کی فیکٹری
کافی نقصان اٹھانے کے بعد بند ہو گئی۔ وہ مہینوں تلاشِ روزگار میں کلکتہ کی
گلیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ لیکن اسے کہیں کوئی کام نہ مل سکا۔ پس ماندہ جو کچھ تھا
رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ اور دیہات واپس جانے کے سوا اسے کوئی دوسرا راستہ
دکھائی نہ دیا۔

رمزو زہری کے ساتھ اپنے گاؤں واپس آگیا۔ وہ دوسروں کے کھیت پر
مزدوری کر کے کسی طرح اتنا حاصل کر لیتا کہ اس کی اور زہری کی زندگی کٹ سکے۔
پھر دیہات میں کوئی ایسا خرچ بھی نہ تھا۔

زہری جوان ہو رہی تھی۔ رمزو کو اس کی شادی کی فکر ہو گئی۔ یہ خیال اسے
ہمیشہ افسردہ کر دیتا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی کی طرح زہری بھی اس سے علحٰدہ ہو جائے گی
لیکن زہری کی شادی اُسے کرانی ضرور تھی۔ زہری سے جب وہ اس کی شادی
کے بارے میں کہتا تو زہری رونے لگتی۔ اس کی سکھی جمنی کو بیاہ کے بعد سے اس کا
شوہر کبھی گھر نہ آنے دیتا تھا۔ وہ سمجھتی کہ اگر اس کا بھی بیاہ ہو گیا تو وہ پھر گھر واپس
نہ آسکے گی۔ زہری کے رونے پر رمزو کو کوئی تعجب نہ ہوتا تھا۔ ہر کنواری لڑکی
شادی کے نام سے رونے لگتی ہے۔ لیکن خود اس کا دل نہ چاہتا کہ زہری بیاہ کر کے

اس سے چھن جائے۔ وہ بہت زیادہ متفکر رہنے لگا۔ زہری اس کی اُداسی کا سبب پوچھتی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ وہ ایک رات بہت دیر تک اسی اُدھیڑ بُن میں پڑا جاگتا رہا۔ ایک طرف زہری کی علیحدگی کی تکلیف دوسری طرف ایک جوان کنواری لڑکی کو اپنے گھر میں بٹھائے رکھنے کی وجہ سے جگ ہنسائی کا خوف وہ انھیں خیالات میں غلطاں سو گیا۔ اس رات خواب میں اس نے میلے کچیلے کپڑے میں ایک بوڑھے انسان کو اپنے سرہانے کھڑا دیکھا۔ بڈھا اس سے کہہ رہا تھا "تم زہری کی شادی کیلئے اتنا پریشان کیوں ہو۔ تمہارے گھر میں تو خود کوئی نہیں ہے۔ تمہیں اپنی خدمت کی ضرورت ہے۔ زہری اگر بیاہ کر کے چلی جائے گی تو پھر تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا۔ زہری بھی تو تم سے الگ ہونا گوارا نہیں کرتی۔ تم خود زہری سے بیاہ کر لو۔ میری خوشی اسی میں ہے۔"

رمزو کی آنکھیں کھلیں تو وہ بڈھے کی صورت پر غور کرنے لگا۔ اس کی شکل زہری کے باپ کے حُلیہ سے ملتی جلتی تھی۔ زہری اپنے بچپن میں برابر رمزو کے آگے اپنے باپ کی شکل وصورت کا خاکہ کھینچا کرتی تھی۔ "زہری کے باپ نے خواب میں مجھے زہری سے بیاہ کرنے کو کہا ہے۔" اسے بھی یہ بات مناسب معلوم ہوئی۔ وہ زہری سے بیاہ کر سکتا تھا۔ وہ بے چینی سے زہری کے اٹھنے کا منتظر تھا۔

"رات میں نے تمہارے بادا کو خواب میں دیکھا ہے۔" زہری اُٹھی تو اس نے کہا۔

"میرے بادا کو!" زہری کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

"ہاں وہ بہت دُبلے ہو رہے تھے۔ کمر کچھ جھکی ہوئی ......"

"اور سر کے بال بھی اُڑے ہوئے ہوں گے۔" زہری نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ان کے سر پر بال نہ تھے۔" رمزو نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے، سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر اُن سے کچھ باتیں بھی ہوئیں؟ وہ مجھ کو پوچھتے تھے؟ میں بھی انھیں پہلے خواب میں بہت دیکھا کرتی تھی۔ لیکن اب میں صرف اُلٹی پلٹی باتیں دیکھا کرتی ہوں۔ بادا کو کبھی نہیں دیکھتی۔"

"ہاں باتیں ہوئیں تمہارے بیاہ کے بارے میں۔"

"لیکن میں تو بیاہ نہیں کروں گی۔ بادا بیاہ کو کہتے تھے؟" زہری نے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"لیکن تمہارے بادا تو کہتے تھے کہ تمہیں بیاہ کرنا چاہئے۔"

"مگر پھر میں یہاں کیسے آسکوں گی۔؟"

"وہ کہتے تھے کہ تم بیاہ کرکے یہیں رہو۔"

"لیکن جمنی بہن کا میاں اسے کبھی گھر آنے نہیں دیتا۔"۔

"تم ایسے سے بیاہ نہ کرو جو تمہیں یہاں سے کہیں لے جائے۔"

"تو پھر بادا کس سے کہتے تھے۔" اس نے لجاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہم سے۔" رمزو نے رُک رُک کر کہا۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اور چہرے پر جوانی کی سی شگفتگی۔ وہ کسی نامعلوم جذبہ سے مغلوب ہو رہا تھا۔ زہری شرما کر اس کے پاس سے چلی گئی۔ اُسے رمزو کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ خاص کر جب کہ اس کے بادا نے کہا تھا۔ وہ خوش تھی کہ جمنی کی طرح اُسے گھر سے علیحدہ نہ ہونا پڑے گا۔

رمزو نے زہری سے بیاہ کر لیا۔ زہری کی طرف سے اب اس کے جذبات ایک دم مختلف تھے۔ زہری اب اس کی بیاہتا بیوی تھی۔ لیکن زہری میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ اب بھی رمزو کی خدمت اور خاطرداری میں اسی طرح مستعد رہتی جب تک رمزو کو کھلا نہ لیتی خود کبھی نہ کھاتی۔ رات گئے دیر تک رمزو کے بدن میں تیل مالش کرتی رہتی۔ رمزو کبھی بیمار پڑتا تو رات رات بھر اس کی دیکھ بھال میں اپنی

نیند حرام کردیتی ۔ اب بھی رمزو کے علاوہ دنیا میں اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی ۔ بستی میں اس کی آمدورفت بہت کم تھی ۔ وہ بھی رمزو کے اصرار سے ۔ ورنہ جب تک رمزو گھر میں رہتا وہ اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی ۔ اور جب وہ کھیت پر چلا جاتا تو گھر کے کام دھندے میں لگ جاتی ۔ رمزو کی جنسی طلب کی تسکین میں وہ کبھی کوئی تامل نہ پیش کرتی ۔ لیکن بالکل اس طرح جیسے وہ اس کی کوئی خدمت انجام دے رہی ہو ۔ یکسر بے اثری کے ساتھ ۔ رمزو اکثر اس سے زوجین کے تعلق کے مناسب چھیڑیں کرتا تو زہری کی طرف سے اسے کوئی جواب نہ ملتا ۔ جیسے وہ قطعاً جنسی تاثرات سے خالی تھی ۔ رمزو کی جوانی کی یادگار بجھتی ہوئی چنگاریاں مشتعل ہو اُٹھتیں ۔ لیکن زہری کے شباب کا شعلہ کبھی نہ بھڑکتا ۔ جیسے اس کا شباب جوانی کا ایک مُردہ بت تھا ۔ زندگی کی حرارت سے محروم ۔

گاؤں کے سب سے بڑے گرہست پیرو میاں کا جوان لڑکا جوہر ، جو شہر میں تعلیم حاصل کرتا تھا ۔ تعطیل کے موقع پر گھر آیا ہوا تھا ۔ زہری اس کے گھر کے کنوئیں سے پانی لانے جایا کرتی تھی ۔ جوہر کی آنکھیں زہری سے چار ہوگئیں ۔ زہری کا شباب اور اس کا سادہ اور بے بناوٹی حسن اس کی نظروں میں گڑ گیا ۔ اسے یقین کامل تھا کہ زہری کا حصول اس کے لیے معمولی بات تھی ۔ زہری جوان تھی اور تندرست ۔ پھر کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی تھی کہ اس کی توجہ کے بعد بھی زہری رمزو سے وابستہ رہ سکے ۔ زہری روز اس کے یہاں پانی لانے جایا کرتی تھی ۔ اُس نے رفتہ رفتہ زہری سے کچھ ملاقات پیدا کرلی ۔ زہری اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں بغیر کسی جھجکے کیا کرتی ۔ لیکن جوہر نے کبھی اس کی گفتگو میں کوئی لگاوٹ نہ پائی ۔ وہ سمجھتا تھا کہ بے تکلفی بڑھنے کے بعد زہری آپ ہی اس کے آگے اپنے شباب کی بربادی کا دُکھڑا روئے گی اور وہ اس کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھا کر آسانی سے اسے اپنا بنالے گا ۔ جوہر کو اپنی

بلند قامت جوانی کی دل فریبی پر بھی کامل بھروسا تھا۔" کیا اس کا مردانہ حسن زہری کے دل میں ویسی ہی تڑپ نہ پیدا کر سکے گا جیسی تڑپ اس کے دل میں زہری کی اٹھتی جوانی نے پیدا کر دی تھی۔" جوہر زہری سے ادھر ادھر کی باتوں میں گھما پھرا کر رمزو کے متعلق اس کے خیالات کی ٹوہ لیتا۔ لیکن اسے کبھی کوئی قابل اطمینان جواب نہ ملتا۔ بلکہ زہری کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا کہ زہری رمزو سے بہت زیادہ وابستہ تھی۔ لیکن جوہر کا دل کبھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ زہری کی ہر "ہاں" کو وہ "نہیں" سمجھنے پر مجبور تھا۔ عورت کی متضاد اور پُراسرار فطرت کا دلائل سے زیادہ اس کے جذبات اُسے یقین دلا رہے تھے۔

جوہر کنویں کے نزدیک کھڑا تھا۔ اس دن زہری بہت دیر کر کے پانی لینے آئی تھی۔

"کیوں آج تم بہت دیر سے آئیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں آج کھیت پر نہیں گئے ہیں۔ طبیعت کچھ سست ہے۔ بید جی کے ہاں دوا لانے چلی گئی تھی۔ وہاں بھیڑ بہت تھی۔ دیر تک ٹھیرنا پڑا۔"

"ارے رمزو میاں بیمار ہو گئے ہیں؟ کیا ہوا ہے؟ آخر بے چارے بوڑھے بھی تو ہو گئے۔ طبیعت کب تک ٹھیک رہے۔ مجھے تو تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔" جوہر نے ہمدردانہ الفاظ میں کہا۔

زہری نے ناگن کی طرح اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور غصہ ٹپک رہا تھا۔ "بوڑھے ہیں تو کیا۔ میں اُن کے آگے جوانوں کو چولھے میں جھونک ڈالوں۔" اس نے برہمی سے کہا اور تیزی سے پانی کا گھڑا سر پر اُٹھا کر چلی گئی۔

جوہر رفتہ رفتہ زہری کے انداز میں حقیقت کا عمل محسوس کرنے لگا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک شکوک کے گھروندے میں بند رہنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ وہ زہری سے اپنے سوال کا فیصلہ کن جواب مانگنا چاہتا تھا۔

زہری کچھ رات گئے بستی میں ایک جگہ تقریب کی شرکت سے واپس آرہی تھی۔ وہ اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کی عادی نہ تھی۔ لیکن رمزو نے اسے بہ اصرار وہاں بھیجا تھا۔ اور رسومات کی تکمیل پر واپسی کی تاکید کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زہری بستی والوں سے شیر وشکر ہوجائے تاکہ اس کے بعد وہ خود کو بالکل بے پناہ محسوس نہ کرے۔ جوہر موقع کا منتظر تھا۔ وہ زہری سے کچھ فاصلہ پر اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ چاندنی رات تھی، ہوا تیز چل رہی تھی۔ زہری تیزی سے قدم بڑھائے چل رہی تھی۔ اس کے سر کا آنچل گر کر ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ اس کے سینے اپنے تناسب کا مقابلہ چاند سے کر رہے تھے۔ چاند کا پورا عکس اس کے چہرہ پر پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند کی کرنیں اس کے شباب کی تصویر پر آخری قلم پھیر رہی تھیں۔ فضا کی سحر آگینی نے جوہر کے آتشِ شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ کھلے لفظوں میں اپنے سراپا سے زہری کے سامنے اپنا سوال پیش کرنے والا تھا۔ اس نے قدم تیزی سے بڑھایا۔ اور زہری کے آگے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا بلند وبالا قد اور چوڑا چکلا سینہ چاندنی کی فیاض ضیاپاشی میں اور زیادہ دلکش ہو رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر زہری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زہری بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس سے دست وگریبان ہوگئی۔ چاندنی کی لبیط لطافت بھی اس کی خشم آلود نگاہوں کو جذب نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔ جوہر کی گرفت دفعتاً ڈھیلی ہوگئی۔ اس کے جذبات کے ہیجان میں سکون پیدا ہوگیا۔ زہری اپنا ہاتھ اس سے چھڑا کر آخری بار اپنی خشمگیں نگاہوں کی آگ اس پر برساتی ہوئی تیزی سے آگے نکل گئی۔

جوہر عبرت و شرم سے عرق عرق ہو رہا تھا۔ زہری کی وفاشعاری اور پاکبازی اُسے مثالی معلوم ہونے لگی۔ اس کے دل میں زہری کی عظمت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ وہ اُسے ایک مقدس دیوی تصور کرنے لگا۔ جس نے پاکبازی اور عصمت مآبی کی مثال قائم کرنے کے لیے دنیا میں جنم لیا تھا۔ زہری کے لیے اس کے دل میں ایک

پاک جذبہ بیدار ہوگیا۔

رمزو کئی ماہ بیمار رہ کر سدھار گیا۔ زہری نے اس کی جان توڑ خدمت کی۔ رمزو کی موت اس کے لئے ایک حادثہ عظیم تھا۔ اس دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ جوہر نے اپنی ماں سے کہہ کر اسے اپنے گھر بلوالیا۔

زہری پیرو میاں کے گھر رہنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ رمزو کو بھولنے لگی۔ اس کی کافر جوانی اب تک ویسی ہی باقی تھی۔ لیکن اس کے انداز میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کی بے پناہ جوانی سے اسے باخبر کردیا تھا۔ اس کے حسن میں احساس کے ساتھ شوخی پیدا ہوگئی تھی۔ جو دیکھنے والی نگاہوں کو گناہ کی ترغیب دینے لگی تھی۔ وہ اپنی طرف اٹھتی ہوئی نگاہوں کا استقبال اپنی نیم وا آنکھوں کی سحر آفریں جنبش اور لبوں کی ایک معنی خیز مسکراہٹ سے کیا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے شباب کی پرسکون دنیا میں یکبارگی ہل چل سی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے دل میں جوہر کے لیے ایک تڑپ محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسی اضطراب آگیں تڑپ جو پہروں چھپ چھپ کر جوہر کو دیکھتے رہنے پر اسے مجبور رکھتی۔ لیکن جوہر کے دماغ پر زہری کی بابت ایسا حسن ظن چھایا ہوا تھا کہ زہری کے انداز کا انقلاب اسے سوجھائی نہ دیتا تھا۔ زہری چاہتی تھی کہ اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالے۔ اس کی آرزو تھی کہ جوہر پھر للچائی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے اور وہ خود کو اس کے تصرف میں وقف کردے۔ لیکن اس کی امید برنہ آتی تھی۔ اس کا امڈتا ہوا شباب اس کی اس مجبوری کے آگے کب تک تھم سکتا اس نے ایک دن جوہر پر افشائے راز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ جوہر کے سامنے اپنے سارے جذبات عریاں کردینے کا۔ جوہر کی جوانی کے آگے اپنی جوانی کا تحفہ پیش کرنے کا۔ اس نے اس ارادہ سے جوہر کے کمرے کی طرف قدم اٹھایا

لیکن دروازہ پر پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ اُسے جوہر پر اپنی خشم گیں نگاہیں یاد آگئیں۔
"شاید جوہر کی آنکھیں اس پر ویسی ہی چنگاریاں برسانے لگیں؟" وہ اُلٹے
پاؤں واپس ہو گئی۔

اس نے کئی بار اس قسم کی کوشش کی۔ لیکن ہر دفعہ اس کا قدم آگے بڑھنے
سے قاصر ہو جاتا۔

اس کی اندرونی کیفیات کا سمندر رفتہ رفتہ اتنا پُر ہیجان ہو گیا کہ اس کی
روک تھام اس کے قابو سے قطعاً باہر ہو گئی اور وہ ایک رات اضطراری طور پر
جوہر کے کمرے میں گھس آئی۔ اس کے سارے بدن میں لرزش تھی۔ چہرہ سے پسینہ
ٹپک رہا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور گالوں کا گلابی پن اور تیز ہو گیا تھا۔
جوہر روشنی سامنے رکھے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر
وہ یکبارگی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں زہری خیر تو ہے؟ تم ایسی گھبرائی ہوئی کیوں نظر آرہی ہو؟" جوہر نے
گھبراتے ہوئے سوال کیا۔

زہری نے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

"آخر بولو تو کیا معاملہ ہے؟ تم اس وقت یہاں کس لئے آگئیں؟ کیا مجھ سے
کوئی کام ہے؟"

"ہاں" زہری نے مشکل سے ادا کیا۔

"کونسا؟ لیکن تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ چلو باہر چل کر باتیں کریں۔"

"نہیں۔"

"یعنی؟"

"یہیں ٹھہرو۔"

"یہاں ٹھہرنا بے موقع ہے"

"ہونے دو۔"

"زہری! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔"

جوہر دروازہ کی طرف بڑھا۔ زہری نے اُس کا راستہ روک لیا۔

"زہری! یہ کیا معاملہ ہے؟"

"تم نہ جاؤ۔" زہری نے ملتجیانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"تو پھر تم کہو نہ، کیا کہنا ہے؟"

"میں کچھ کہنے نہیں آئی ہوں۔" زہری نے نیچی نظریں کئے ہوئے جواب دیا۔

"مگر، مگر میں باہر جاتا ہوں۔" جوہر نے یہ کہتے ہوئے تیزی سے قدم دروازے کے باہر بڑھایا۔ اور چلا گیا۔

دوسرے دن زہری جوہر کے گھر سے اُٹھ آئی۔ اس کی جوانی کا سودا کرنے والے بستی میں کتنے ہی تھے۔ اسے ان سب کے یہاں پناہ مل سکتی تھی۔ ان سبھوں میں اس کی نظرِ انتخاب ارزانی پر پڑی۔ ارزانی عرصہ سے اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ راستہ میں جب مڈبھیڑ ہوجاتی تو اس سے طرح طرح سے چھیڑیں کرتا۔ زہری اس کی چھیڑوں میں گُدگدی ضرور محسوس کرتی۔ لیکن وہ اسے اس قابل نہ سمجھتی تھی کہ اس کی طرف التفات کرے۔ وہ تاڑی بہت پیتا تھا۔ اور اکثر نشہ کی حالت میں آپے سے گذر جایا کرتا تھا۔ لیکن جوہر کے آگے اپنی شکست محسوس کرنے کے بعد ارزانی کے عیوب اس کی نظروں سے غائب ہوگئے۔ اور اس نے خود کو اس کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

زہری ارزانی سے نکاح کرکے اس کے ساتھ رہنے لگی۔ ارزانی کی تاڑی کی صحبتوں میں جو ادھر کے منچلے شریک ہوتے تھے۔ زہری کو ان کی چھیڑوں میں بہت زیادہ لذّت محسوس ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اپنی جنس گراں بہا کا

سوداان سبھوں کے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ بیوپار کسی مالی منفعت کے لئے نہ تھا۔ اس لیئے اُسے خریداروں کی کمی نہ ہوئی۔ وہ ان سبھوں کو شاد کام کرنا چاہتی تھی۔ اس کی اپنی مسرّت و تسکین کا راز اسی میں مضمر تھا۔

زہری کے گاہکوں نے بہت جلد اس کے حُسن کا خزانہ خالی کر دیا۔ اور اس کے چہرے کی ساری مٹھاس چوس لی۔ وہ قبل از وقت بوڑھی معلوم ہونے لگی۔ اس کے قدردان ایک ایک کرکے اس سے علیحٰدہ ہو گئے۔ لیکن زہری اب تک تشنہ کام تھی۔ اس کے جنسی بہاؤ کا سیلاب اب تک اُمڈا آرہا تھا۔

وہ اب پاگل خانہ میں بند ہے۔ اپنے جسم پر کوئی کپڑا نہیں رہنے دیتی۔ اور اپنے عُریاں اعضاء کی طرح طرح سے نمائش کرکے ہنسی کے لامتناہی سلسلوں میں کھو جایا کرتی ہے۔

ساقی جولائی ۳۸ء

●

ردِ عمل

انگلستان میں چھ سال کے قیام نے حسین کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا
جب وہ یورپ کی آزادانہ زندگی سے اپنے آبائی دیہاتی ماحول کی بندشوں اور
بے سبب رکاوٹوں کا مقابلہ کرتا تھا تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی زندگی یورپ میں
گذار دے۔

"اُف ہم ہندوستانی مرد عورتوں کے ساتھ کس قدر نامنصفانہ سلوک کرنے کے
عادی ہو گئے ہیں۔" وہ اکثر سوچتا۔ "ہم نے خود ذہنی نشو و نما اور ترقی کے سارے
دروازے اُن پر بند کر رکھے ہیں لیکن سمجھتے اور کہتے یہ ہیں کہ عورتیں جسمانی اور دماغی
طور پر ہم سے اس درجہ پست ہیں کہ ہم اُن سے مساویانہ برتاؤ کر ہی نہیں سکتے۔"
انگلستان کی عورتوں کا کلچر، اُن کی تعلیم، اُن کی طرزِ زندگی سے وہ اس درجہ متاثر

ہوگیا تھا کہ وہ اُنھیں نسائیت کا اعلیٰ ترین اور قابلِ رشک نمونہ سمجھنے لگا تھا۔ ابتدا میں کھانے کی میز پر جب وہ اپنی لینڈ لیڈی کی لڑکیوں کو سائنس، فلسفہ، بین الاقوامی سیاست پر گفتگو کرتے سنتا تو اُس کے کان میں اپنی ماں اور بہنوں کی گھریلو باتیں ماماؤں کے قصے قضیے، ہمسایوں کے خانگی معاملات کے تذکرے گونجنے لگتے اور اُس وقت اُسے آپ ہی آپ اپنے اوپر شرم سی آنے لگتی۔ اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ اُن لڑکیوں کی عام معلومات کا ذخیرہ اُس کے اپنے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع تھا۔ وہ برابر سے یہ سمجھتا آیا تھا کہ مرد عورت سے صرف جہالت تنگ نظری پست خیالی اخذ کر سکتا ہے لیکن انگلستان میں وہ حیرت کے ساتھ محسوس کرتا تھا کہ عورتوں کی روزمرہ ملاقاتوں اور گفتگو سے خود اُس کی واقفیت اور علم میں روز روز اضافہ ہو رہا تھا۔ "عورت بھی مرد کی افزونیٔ علم و دانش کا ذریعہ بن سکتی ہے!" اُسے یہ مشاہدہ شروع میں عجیب سا معلوم ہوا تھا۔

یورپ کی زندگی نے حسین کو اس کا کامل یقین دلا دیا تھا کہ عورت مرد سے مساویانہ حقوق طلب کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ "کوئی وجہ نہیں کہ مرد اپنے مقابلہ کی ایک ہستی کو اس طرح پامال کرتا رہے، عورتوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں اسی حد تک آزادی ملنی چاہیے جتنی مرد کو حاصل ہے۔ انھیں اپنی زندگی کی باگ ڈور آپ سنبھالنے دینا چاہیے۔ وہ اپنے اچھے بُرے کی آپ تمیز کر سکتی ہیں۔ مرد کو کیا حق ہے کہ اُن کے افعال و کردار پر اپنے فیصلے منضبط کرتا رہے؟"

حسین نے اکثر ارادہ کیا کہ وہ اپنی دوستوں میں سے کسی ایک کو اپنی شریک زندگی بنالے۔ لیکن وہ برابر اس ارادے کی تکمیل کو ملتوی کرتا رہا۔ "اس میں جلدی کیا ہے۔ ہندوستان واپس جاتے وقت دیکھا جائے گا۔" یہاں تک کہ ہندوستان کی واپسی کا وقت آگیا اور حسین اپنی ایک عزیز ترین دوست سے شادی کا وعدہ لے کر سینہ میں داغ مفارقت چھپائے انگلستان سے روانہ ہوگیا۔

ہندوستان پہونچ کر حسین ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا اور شادی ملازمت کے حصول پر ملتوی رکھی گئی۔ عرصے تک بے کار کوششیں کرنے کے بعد حسین کو کلکتہ میں ایک بنک کی منیجری مل گئی۔ تنخواہ اتنی نہ تھی کہ حسین ایک یوروپین بیوی کے اخراجات کی کفالت کرسکتا۔ پھر ایک عرصے کی مسلسل علیحدگی کے بعد ہرچہ از دیدہ دور از دل دور کے مصداق محبت کی آگ بھی کچھ مدھم سی پڑ گئی۔ خلاصہ یہ کہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا۔ اور حسین کو اپنی نظرِ انتخاب ہندوستانی لڑکیوں کی طرف موڑنی پڑی۔ لیکن اس کا معیار کافی بلند تھا۔ "لڑکی نہایت تعلیم یافتہ ذہین اور روشن خیال ہو۔ اعلیٰ سوسائٹی میں ملنے جلنے کے قابل"۔ کوئی ہندوستانی لڑکی اس کی نظر میں جچتی نہ تھی۔

حسین نے مس خالدہ بی۔ اے۔ سے شادی کرلی۔ شادی دفعتاً نہیں ہوئی۔ پہلے ملاقاتیں ہوئیں، پھر دوستی پیدا ہوئی اور آخر میں شادی۔ حسین جیسی بیوی چاہتا تھا اسے مل گئی۔ خالدہ خوب صورت تھی، تعلیم یافتہ، روشن خیال اور ساتھ ہی فنون لطیفہ کی ماہر، سوسائٹی کی اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ میں اس کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اس کی بدولت حسین کے تعلقات کلکتہ کے ان گھرانوں سے پیدا ہوگئے جہاں شادی سے قبل وہ کسی کی سفارشی چٹھی لے کر بھی مشکل سے پہونچ سکتا تھا۔

" کیوں آج بنرجی کے یہاں پارٹی میں نہ جاؤ گی۔؟ ۴ بجے ہیں۔ پانچ بجے کا وقت ہے نا۔ تم نے تو اب تک کپڑے تک نہیں بدلے ہیں"۔

" نہیں۔ میں تو آج نہ جاسکوں گی۔ "

" کیوں؟۔ " حسین نے تعجب سے سوال کیا۔

" جانتے ہو۔ دسمبر میں آل انڈیا آرٹ اگزبیشن ہونے والی ہے۔ میں نے

اب تک اپنی تصویر کا موضوع تک نہیں سوچا ہے ۔ تمہیں یاد ہے ، جمالی میری پچھلی تصویر کی کس قدر تعریف کر رہا تھا ۔ جمالی خود آرٹسٹ بھی ہے اور نقاد بھی ۔"

خالدہ کے چہرے پر اس کیفیت کی جھلک نمایاں تھی ۔ جب ہم کسی ممتاز شخصیت سے متاثر ہو کر محظوظ ہوتے ہیں ۔ حسین نے اسے محسوس کیا اور اس کا چہرہ بے رونق ہو گیا

آج ۵ ۱/۲ بجے وہ آئے گا ۔ مجھے اُسے لانے کے لئے اسٹیشن جانا ضروری ہے ۔ میری طرف سے بنرجی سے معافی مانگ لینا ۔"

" لیکن کیا ضروری ہے کہ تم خود لانے جاؤ ۔ شوفر کو ......"

" نہیں جمالی بڑا ذکی الحس ہے ۔ آرٹسٹ فطرتاً نازک مزاج بھی ہوتا ہے ۔ گرچہ میں اس سے مستثنیٰ ہوں ۔" خالدہ نے حسین کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے اپنا رخسار اُس کے لبوں کے قریب کر دیا ۔ حسین نے خالدہ کا بوسہ لے لیا ۔ لیکن بالکل اضطراری طور پر بے کیفی کے ساتھ ۔ حسین کو اس کا احساس بھی ہوا ۔

" اچھا ۔ تو کیوں نہ جمالی کو تم ساتھ لیتی آجاؤ ۔ کچھ دیر ہی ہو جائے گی تو کیا ؟"

" جمالی یونہی بے بلائے وہاں پہونچ جائے گا ؟ وہ تم سے زیادہ شریف اور باعزّت ہے ۔" خالدہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" تو تم نہیں آؤ گی ؟" حسین نے شکست خوردہ آواز میں پوچھا ۔

" کیسے آسکتی ہوں ؟"

" اچھا تو پھر تم کار اسٹیشن لے جاؤ گی ؟ میں ٹیکسی منگوا لیتا ہوں ۔

" ہاں ٹھیک ہے ۔"

" ٹیکسی کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ حسین کے دماغ میں بے ربط خیالات کا سلسلہ بن رہا تھا ۔" خالدہ کی جمالی سے دوستی مذاق کی ہم آہنگی کی بنا پر ہے ۔ دونوں آرٹسٹ ہیں ۔ آرٹ آخر ہے کیا ؟ اور پھر کلاسیکل آرٹ ۔ مجھے تو ایک بے معنی سی چیز معلوم ہوتی ہے ۔ رفائیل ، جبرئیل ، مانی آخران کی مقبولیت کا

کچھ باعث بھی تو ہوگا۔؟ مگر کیا۔ مختلف اوقات میں انسانی دماغ میں اثر پذیر ہونے کی مختلف صلاحیتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بعض وقت ہمیں ساری چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کسی کو موقع سے اُن کی تصویریں کھلی معلوم ہوگئی ہوں گی۔ دو چار کے نزدیک اُس نے تعریفیں کر دیں۔ زیادہ تر انسان دوسروں کے فیصلہ پر اچھے بُرے کی تمیز کرنے کے عادی ہیں۔ اِن تعریفوں کے زیرِ اثر اُنہیں بھی یہ تصویریں اچھی معلوم ہوئی ہوں گی۔ پروپگنڈا ہوگیا۔ رفائیل اور آنجلو پیدا ہوگئے۔ بعد کی نسلیں ان کی روایتی تعریفوں سے متاثر ہوکر اُن پر نظریں ڈالتی رہیں۔ اُنہیں بھی یہ اچھی ہی معلوم ہوئیں۔ محسوسات کا معاملہ ہے۔ فلسفہ یا ریاضی کا مسئلہ نہیں کہ اُن کی صحت وغیر صحت ثبوت یا دلائل کے ذریعے پرکھی جا سکتی۔ آرٹ وارٹ صرف ڈھکوسلا ہے۔ فرواڈ بھی تو یہی کہتا ہے۔ انسان کی فطرت ادنیٰ اس کی آیڈیل (مثالی) شخصیت کو دھوکہ دے کر آرٹ کے بھیس میں اپنی تسکین کرتی ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کمزور شخصیتیں آرٹ کی مدّاح ہوسکتی ہیں۔ جنھیں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی قوت نہیں۔ میں ان شخصیتوں میں نہیں! حقیقت کا مقابلہ اس کے اصلی رنگ میں کرنا چاہیئے۔ مَیں اگر اپنے نفسانی محرکات سے مغلوب ہو جاتا ہوں تو کامل اعتراف کے ساتھ۔ لیکن یہ احمق آرٹسٹ خود کو اور اپنے ساتھ ایک عالم کو مبتلائے فریب کر کے اِنہیں ترغیبات کے شکار ہوتے ہیں۔ شاید خالدہ کو آرٹ سے روشناس جمالی ہی نے ..... " موٹر بنرجی کے دروازے پر رُکی اور حسین کوٹھی میں داخل ہوگیا۔

کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی کے بیشتر افراد پارٹی میں موجود تھے۔ حسین ان سبھوں سے پوری طرح روشناس ہوچکا تھا۔ ان میں سے ہر شخص حسین سے خالدہ کے نہ آنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔ حسین کو ان کے سوالات سے تکلیف ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ یا اس لئے کہ خالدہ کا

اُس کے ساتھ نہ ہونا خود اُسے بھی شاق گذر رہا تھا۔

"آپ تنہا کیوں ہیں؟ مسز حسین کو کہاں چھوڑا؟ آئیں گی نا؟" بنرجی نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

حسین نے محسوس کیا کہ بنرجی کو اس کے آنے کی کوئی خوشی نہ تھی، اُسے صرف خالدہ کے نہ آنے کا افسوس ہو رہا تھا۔ حسین کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ پارٹی میں حسین کا مطلق جی نہ لگا اور وہ بنرجی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے پارٹی ختم ہونے سے قبل واپس ہو گیا۔

خالدہ جمالی کو لے کر آ چکی تھی۔

"تم آ گئے۔ بہت جلد فرصت ہو گئی۔ جمالی اس کمرے میں ہے۔ تم کھانا تو نہ کھاؤ گے؟ میں ابھی آئی۔" خالدہ نے یہ ساری باتیں ایک ساتھ کہہ ڈالیں اور حسین کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے چلی گئی۔ حسین کو اس کا یہ انداز غیر سنجیدہ معلوم ہوا۔ وہ جمالی کے کمرے میں پہونچا۔ جمالی کپڑے اُتار کر قدِ آدم آئینے کے سامنے بال دُرست کر رہا تھا۔ کمرہ میں قدم رکھتے ہی حسین کو جمالی کا عکس نظر آیا۔ دُبلا پتلا جسم، ضرورت سے زیادہ لمبی ناک پتلی پتلی خمدار اُنگلیاں، گھونگریلے بالوں کے پیچ و خم میں اُلجھی ہوئی۔

"اسے عورت ہونا چاہئے تھا۔" حسین کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا۔

جمالی نے حسین کے قدموں کی آہٹ پا کر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہلو مسٹر حسین۔ پارٹی سے اس قدر جلد فرصت ہو گئی۔؟" حسین کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے جمالی چاہتا ہو کہ وہ پارٹی سے دیر سے واپس ہوتا۔

"ہاں میں قبل ہی چلا آیا۔"

"میں بھی ان پارٹیوں سے زیادہ تر جلد ہی بھاگ جایا کرتا ہوں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح مختلف خیال اور مختلف مذاق کے لوگ اگر ایک جگہ اکٹھا

ہو گئے تو اس میں تفریح کون سی ہوئی۔ آپ جانتے ہیں مجھے آرٹ سے دلچسپی ہے اگر ایک عامیانہ اور غیر لطیف مذاق کا انسان میرے برابر پارٹی میں بیٹھ جائے اور مجھ سے چھیڑ چھیڑ کر میونسپلٹی اور کونسل کے انتخابات پر گفتگو کرنے لگے تو آپ ہی بتائیے اس سے سنگین سزا میرے لئے اور کونسی تجویز کی جاسکتی ہے۔"

حسین نے ایسا محسوس کیا کہ جمالی کا روئے سخن اسی کی طرف تھا۔

"شاید آپ میرے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ ہمارا سماجی دماغ اب تک اس درجہ دقیانوس اور پست ہے کہ ہمارے بیشتر افعال بے معنی اور مہمل ہونے کے باوجود اپنے اندر ہمارے لئے جاذبیت رکھتے ہیں۔ صاحب میں تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے وہ افراد جنھیں اپنی ترقی اور اپنے کلچر پر ناز ہے اسی حد تک روایتی رسوم وقیود کے پابند ہیں جس قدر ایک سیدھا سادا دیہاتی کاشت کار۔ یقین مانیئے مجھے تو کوئی آدمی ملنے کے قابل نظر نہیں آتا۔ شاید آپ کو بھی اس کی واقفیت ہو گی کہ سوسائٹی میں میں سوشل نہ ہونے کی بنا پر کافی بدنام ہوں۔"

"درست ہے۔" حسین نے غیر ارادی طور پر کہا۔ اُسے جمالی کی شخصیت میں ایک مکروہ عنصر نظر آنے لگا۔ "یہ شخص بڑا مغرور ہے۔"

"اچھا مسٹر جمالی آپ آرام سے کپڑے وغیرہ اُتار کر ٹھیک ہو جائیے۔ پھر ملاقات رہے گی۔"

تھوڑی دیر بعد جمالی، حسین اور خالدہ کھانے کے کمرے میں پہونچے۔ حسین نے جمالی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بازو کی کرسی پر خود بیٹھ گیا۔ خالدہ میز کی دوسری طرف بیٹھی۔ آداب نشست کے اعتبار سے اُسے جمالی کے بغل میں بیٹھنا چاہئے تھا۔ اُسے خود ان باتوں کی چنداں پروا نہ تھی لیکن حسین ان کا سخت پابند تھا۔ حسین کی اس فروگذاشت پر اُسے کچھ اچنبھا سا ہوا۔

"آرٹ اکزیبیشن کے لئے آپ اپنی تصویر مکمل کر چکے ہوں گے، مسٹر جمالی؟"

حسین نے پوچھا۔

"میں نے ایک تصویر تو ان دنوں بنائی ہے لیکن اکزبیشن کے لئے نہیں۔ سچ پوچھئے تو میں آرٹ کی نمائش کا قائل نہیں۔ صنعت و حرفت کی نمائش میری سمجھ میں آسکتی ہے۔ تجارتی دنیا میں اشتہار کی ضرورت ہمیشہ رہا کی ہے۔ اور صنعت و حرفت کے اشتہار اور اُن کے فروغ کا نمائش سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن آرٹ کی نمائش کے معنی کیا ہوئے؟ آرٹ کا مقصد صنعت و حرفت کے مقاصد سے بالکل جداگانہ ہے۔ صنعت و حرفت کی غرض و غایت ملک کی معاشی و اقتصادی حالت کی سدھار ہے برخلاف اس کے آرٹ کسی خارجی ضرورت کی فراہمی نہیں کرتا۔ آرٹ کا صحیح نصب العین آرٹ فور آرٹ سیک (آرٹ، آرٹ کے لئے) ہے۔ میں تو آرٹ کو ذریعہ شہرت تک سمجھنا آرٹ کے لئے ناروا سمجھتا ہوں۔ چہ جائیکہ آرٹ کو صنعت و حرفت کی صف میں لاکر اُسے بھی کسب معاش کا ذریعہ بنایا جائے۔ صنعت و حرفت کا تعلق خالص ہماری مادّی اور خارجی ضروریات سے ہے۔ آرٹ کا لگاؤ ہماری وجدانی اور تجلیاتی تسکین سے۔ آرٹ کی تخلیق اور صنعتی ایجاد کا بنیادی فرق ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ صنعت کے ذریعے ہم فطرت کے مادی خزانوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ فطرت تنہا ہماری بڑھتی ہوئی عملی ضرورتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ مادّے کی فطری ترتیب میں اُلٹ پھیر پیدا کر کے اُسے فکر انسانی کے وضع کردہ سانچوں میں ڈھالنا ہی صنعت کا کمال ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے لئے نئے نئے ایجادات پیش کرنا سائنس کا مقصد عالی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ سائنس کی بلندی و پستی کی جانچ اس کے عملی نتائج کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے آرٹ کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہنی کارخانوں کو معطل کر کے اپنی صنعتی صلاحیتوں سے دست بردار ہو جائیں اور پھر وجدانی شعاعوں کی باریک کرنوں سے

اس نقاب کو اُدھیڑ پھینکیں جو فطرت کے چہرے پر ذہن نے کمال احتیاط کے ساتھ بن رکھی ہے۔ آرٹسٹ فطرت میں جذب ہو کر فطرت کا بے واسطہ مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا آرٹ اسی مشاہدہ کی نامکمل ترجمانی ہے۔ میرا خیال ہے مسٹر حسین دنیا تیزی سے پستی کی طرف جا رہی ہے۔ انسانی دماغ کا فطری تنوع جس کے ذریعے وہ زندگی کے مختلف پہلو پر جداگانہ نگاہ ڈال سکتا تھا رفتہ رفتہ اپنا اثر کھوتا جا رہا ہے ہم ہر چیز کو ڈیماکریٹک اصول پر رکھنے لگے ہیں۔ آرٹ کی جانچ پڑتال کے لئے بھی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جن کے فیصلوں کا انحصار مجالس قانون ساز کی طرح کثرت آراء پر ہوتا ہے۔ لیکن آپ تصوّر کیجئے آرٹ کو جمہوریت کے پابند کرنا کیسی فاش غلطی ہے۔ سوشلزم مجھے بھی اچھی لگتی ہے لیکن اس نوع کی نہیں جس میں انسان کی انفرادی صلاحیتوں کا فرق نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عوام اور خواص کا فرق مادّی ضرورتوں اور خارجی آرام و آسائش کے اعتبار سے مٹایا جا سکتا ہو۔ لیکن فطری اور خصوصاً جمالیاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے عوام اور خواص کا فرق قطعاً غائب نہیں کیا جا سکتا۔ یہی فرق زندگی کے ارتقائی منازل کا آئینہ ہے۔ اس کو مٹانے کی کوشش زندگی کی ارتقا کا منکر ہونا ہے۔ زندگی اپنا ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ چند خصوصی صلاحیتوں کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ پھر اپنے تخلیقی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے زندگی ایک لمحے کو اپنی فن کاری پر ناز کرتی ہوئی ٹھٹک جاتی ہے۔ لیکن بہت جلد ہی یہ صلاحیتیں عام ہو کر بے مایہ بن جاتی ہیں۔ زندگی دوسرا قدم اُٹھاتی ہے۔ ارتقا اسی طرح ہوتا رہا ہے۔ اور شاید ہوتا رہے گا۔ کوئی اسے کس طرح روک سکتا ہے؟ سوشلزم اور بالشوزم کا سیلاب تو خود زندگی کے فطری تلاطم کا ایک وقتی اور عارضی منظر ہے۔ اس کی رَو اگر زندگی کے دھارے کے خلاف جا رہی ہے، تو بہت جلد فنا ہو جائے گی۔ دریا کی سطح کا تموّج کبھی دریا کے بہاؤ کا راستہ نہیں مقرر کر سکتا۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں مارکس اور لینن کی سوشلزم موجودہ

سیاسی ہیجان میں کس طرح اپنے اصولی راستہ سے بھٹکتی چلی جارہی ہے۔"

"اُف تم لگے فلسفہ بکنے۔ شاید آپ کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ آپ نے اس وقت ایک خاص لمبی تقریر فرما دی۔ جمالی تم نے کبھی خموش رہ کر بھی کھانا کھایا ہے؟" خالدہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے جمالی کے لئے کئی خاص چیزیں پکوائی تھیں۔ جنھیں جمالی گفتگو کی رَو میں قطعاً بے توجہی کے ساتھ کھا رہا تھا۔

"معاف کرنا خالدہ میں بھول گیا تھا۔ تمہیں میری گفتگو پسند نہ آئی ہوگی۔ تم تو ہر سال نمائش میں تصویر بھیجا کرتی ہو۔" خالدہ کھسیانی سی ہوگئی۔ "یہ میرے ذاتی خیالات تھے۔ ممکن ہے تمہیں ان سے موافقت نہ ہو۔ ٹھیک ہے۔ تم عورت ہو۔ عورت کی فطرت میں نمائش ضروری ہے۔ کیا عجب ہے فطرت نے اپنے جمالی پہلو کے نمود کی غرض سے عورت کی تخلیق کی ہو۔ اور عورت کی شخصیت کا راز فطرت کے اسی ارادے کی تکمیل ہو۔ پھر تو عورت اور نمائش لازم و ملزوم ہیں۔ اگر میری گفتگو تمہیں پسند نہ آئی ہو، تو میں خوشی سے واپس لے سکتا ہوں۔" جمالی نے ملتجیانہ نگاہ سے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جمالی تم باوجود فلسفی ہونے کے بڑے احمق ہو۔" خالدہ نے ہنس کر جواب دیا

"ہاں۔ احمق اور فلسفی تو ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔" حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

"حسین کو اس طرح نہ کہنا چاہیئے تھا۔" خالدہ نے محسوس کیا۔

کھانا ختم ہوا اور جمالی شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا

حسین اور خالدہ سونے کے کمرے میں آئے۔

"تمہیں جمالی کو اس طرح نہ کہنا چاہیئے تھا۔"

"لیکن میں نے تو تمہارے بعد کہا۔"

"مجھ سے تو اس کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ تم سے وہ اتنا بے تکلف نہیں ہوا ہے

ممکن ہے اُسے بُرا لگا ہو۔"

"اُسے بُرا لگا ہو یا نہیں لیکن تمہیں ضرور بُرا لگ رہا ہے۔" حسین نے ترش روئی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میرے دوست کی توہین میری اپنی توہین ہے۔" خالدہ نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

"ہوا کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جمالی کی شخصیت پر کیوں اس قدر فدا ہو مجھے تو وہ ایک نہایت مغرور انسان معلوم ہوتا ہے۔ حد درجہ خود بین اور خود پسند۔ ساری بکواس کی غرض اس کی اپنی خود ستائی تھی۔ سمجھتا ہے کہ اس جیسا روشن دماغ اور بلند نظر کوئی دوسرا انسان نہیں۔"

"حسین! میں جمالی کی شان میں یہ توہین آمیز جملے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اُس کی شخصیت کی عزّت کرتی ہوں۔" خالدہ چادر میں مُنہ ڈھانک کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن صبح حسین حسب معمول دفتر کے کام میں مصروف ہو گیا اور گیارہ بجے دفتر چلا گیا۔ اس کی طبیعت کام میں نہ لگی۔ اور وہ سویرے ہی دفتر سے واپس چلا آیا۔ خالدہ اور جمالی باہر گئے ہوئے تھے۔ حسین آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور خیالات کے سمندر میں بہنے لگا۔ "خالدہ کی جمالی سے دوستی کب سے ہے؟" جمالی کے ساتھ خالدہ کے تعلقات اسے نہایت نازیبا معلوم ہوئے۔ "اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ پھر خالدہ اس قدر برافروختہ کیوں ہو گئی؟ خالدہ، جمالی کو چاہتی تو نہیں؟" اس خیال سے اس کے دماغ میں ایک ناخوشگوار دھند لکا چھا گیا۔ "نہیں دونوں کی دوستی مذاق کی ہم آہنگی کی بنا پر ہے۔ لیکن مذاق کی ہم آہنگی اتنا گہرا تعلق پیدا نہیں کر سکتی؟ خالدہ جمالی کی شخصیت کا احترام کرتی ہے لیکن اتنا زیادہ کہ جمالی کے خلاف ایک بات سُن نہیں سکتی؟ کیا واقعی خالدہ جمالی کی شخصیت کی صرف عزّت کرتی ہے؟" اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے اس سوال کا جواب اُسے اثبات میں مل جاتا۔

خالدہ اور جمالی کمرے میں داخل ہوئے۔ خالدہ حسین کو اس وقت بہت زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ جمالی حسین کی نگاہ میں پس منظر کا کام کر رہا تھا۔ خالدہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ حسین کے دماغ نے فیصلہ کیا کہ اس نے اُسے کبھی اتنا خوش نہ دیکھا تھا حسین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"ہم لوگ کل ایک ہفتہ کے لئے دارجلنگ جا رہے ہیں۔ اکزبیشن کے اب کم ہی دن رہ گئے ہیں۔ یہاں تو ایک منٹ چین سے بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر ایک ہفتہ کے لئے بھی یہاں کی ہنگامہ آرائیوں سے دُور نہ ہو جاؤں گی تو پھر اس دفعہ اکزبیشن میں میری تصویر نہ جا سکے گی۔ گرچہ مسٹر جمالی اُسے ایک حماقت سمجھتے ہیں۔ کیوں صاحب؟" خالدہ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جمالی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

حسین کو وہ اس وقت بہت زیادہ حسین معلوم ہوئی۔ شاید وہ کبھی اتنی حسین نظر نہ آئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جمالی اس وقت اس جگہ نہ ہوتا۔

"کل جاؤ گی؟" حسین نے کچھ دیر خموشی کے بعد یکبارگی سوال کیا۔ جیسے وہ دفعتاً چونکا دیا گیا ہو۔

"ہاں کل ہی تو۔"

"کس وقت؟"

"صبح سویرے یہاں سے روانہ ہوں گی۔"

"کیا جانے کا فیصلہ کر چکی ہو؟"

"کیا کروں بغیر جائے بنے گا نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" حسین نے جملہ کافی دیر میں ادا کیا جیسے کوئی اس سے زبردستی بلوا رہا ہو۔

"تم دفتر سے ابھی آئے؟"

"ہاں!" حسین نے جواب کے اختصار کو راست گوئی پر ترجیح دی۔ شاید اس لئے

کہ وہ اس وقت اس سے زیادہ کچھ بول نہ سکتا تھا۔

خالدہ اور جمالی دارجلنگ چلے گئے۔ خالدہ کے جانے کے بعد جبین طرح طرح کی ذہنی کشمکش میں مُبتلا ہوگیا۔ اُسے رات بھر نیند نہ آئی۔ اُس کے دماغ میں طرح طرح کے پراگندہ خیالات مجتمع رہتے۔ وہ کبھی فیصلہ کرتا کہ تار بھیجکر خالدہ کو بُلالے لیکن اُسے خود اپنا فیصلہ حماقت آمیز معلوم ہوتا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی مرض میں مبتلا ہو رہا ہو۔ اُس کی بھوک مُردہ ہوگئی تھی۔ وہ اپنے قلب کی رفتار میں اضمحلال محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اپنی اس کیفیت کا کوئی سبب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

خالدہ کی روانگی کے چوتھے دن اُس نے یکبارگی فیصلہ کیا کہ وہ اسے تار بھیج کر بُلالے۔ اُسے اپنے فیصلہ پر بھروسہ نہ رہا تھا اس لئے اس نے فوراً اس پر عمل کر ڈالا۔ تار چلا گیا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ خالدہ کے سامنے کونسا عذر پیش کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ اُس نے اپنے دماغ کو جذبہ کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ "خالدہ کو مدناپور بھیج دوں گا۔ کلکتہ سے دُور، یہاں کی مسموم اور گناہ پرور فضاؤں سے دور، دیہات کی سادہ اور معصوم آب و ہوا میں۔ اُسے کچھ دن وہیں رہنا چاہیئے۔" مگر کیوں؟ اس نے اپنے دماغ سے کبھی یہ سوال نہ کیا۔ شاید اس لئے کہ وہاں اُسے کوئی جواب نہ مل سکتا تھا۔

خالدہ دوسرے دن دارجلنگ سے واپس آگئی۔ سہمی ہوئی، طرح طرح کے توہمات سے۔ اُس نے گھبرائی ہوئی نظر جبین پر ڈالی۔ جبین کا چہرہ اُسے بے رونق معلوم ہوا۔ انتشار آگیں۔ اس نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت۔ تم نے تار میں سبب نہ لکھا۔ میں راستے بھر طرح طرح کے خیالات سے اُلجھتی رہی۔ خدا کا شکر ہے تمہیں بہ خیر پا رہی ہوں۔ جلد کہو کیا بات ہے۔"

"کل ہمیں ایک خاص ضرورت سے مدناپور چلنا ہے۔ اسی لئے تمہیں بلانا پڑا۔"

"آخر کونسی ضرورت ہے۔" خالدہ نے بے رُخی سے سوال کیا۔

"میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

"لیکن میں تو ابھی جاننا چاہتی ہوں۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ایسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ تمہیں مجھے مدناپور جانے کا سبب بتانا ہی ہوگا۔"

"نہیں میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔"

"تمہیں بتانا ہوگا۔" خالدہ کا چہرہ غصّہ سے گلابی ہو گیا۔

"میں نہیں بتا سکتا۔" حسین نے بے اثری سے کہا۔

"تو پھر میں بھی مدناپور نہیں جا سکتی۔" خالدہ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جانا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں تم کس طرح نہیں جاتیں۔ تم میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ میں نے تمہیں سر چڑھا رکھا ہے، تم عورتیں کبھی اس برتاؤ کی مستحق نہیں۔ تمہاری قوم کبھی اس قابل نہیں کہ اُس کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ میں تمہاری خود سری اب ایک منٹ کو برداشت نہیں کر سکتا۔" حسین غصّہ سے تھرتھرا رہا تھا۔

خالدہ نے اُسے کبھی اس طرح غصّہ ہوتے نہ دیکھا تھا اور وہ بھی اپنے اُوپر۔ اس کے حواس مختل ہو گئے۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ اُس کی حلق میں پھنس گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی، زار و قطار۔ حسین کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن حسین، خالدہ کو مدناپور لے گیا، اور اُسے وہیں چھوڑ کر کلکتہ واپس چلا آیا۔

حسین کا آبائی گھرانہ نہایت قدامت پرست، رسم و رواج کا پابند اور موجودہ تہذیب و تمدّن سے ناآشنا تھا۔ اس کی ماں ایک پُرانے خیال کی عورت تھی جو مکان کی چہار دیواری کے اندر بند رکھا جانا اپنا فطری حق سمجھتی ہے اور جس کے نزدیک گھر سے باہر قدم نکالنا جلاوطن کر دیئے جانے کے برابر ہوا کرتا ہے، جو گھر سے باہر

نکلنے والی عورتوں سے حجاب رکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتی ہے جتنا غیر مردسے۔ حسین کی آزادانہ روش اُس کی ماں کو مطلق پسند نہ تھی اور حسین کی خالدہ سے شادی اُس پر نہایت شاق گزری تھی۔ ایسے ماحول میں خالدہ کس طرح زندگی گذار سکتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دماغی صلاحیتیں رفتہ رفتہ معطّل ہوکر مفقود ہو جانے والی تھیں۔ اُس نے حسین کو اپنے کلکتہ آنے کے متعلق متواتر خطوط لکھے لیکن حسین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حسین کی اس خاموشی کا راز کیا تھا، حسین نے اُسے مدنا پور کیوں بھیج دیا۔ حسین اپنے گھر کی فضا سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ وہ اس فضا میں رہنا ایک منٹ کے لئے بھی پسند نہ کرتی تھی۔ حسین خود بھی تو اپنے والدین کی قدامت پسندی، اُن کی دقیانوسی روش کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ پھر اُس میں دفعتاً ایسا انقلاب کیوں پیدا ہو گیا؟ اُسے حسین پر غصّہ آنے لگا۔ جس نے رفتہ رفتہ نفرت کی صورت اختیار کر لی۔ حسین اُسے ایک مکّار، فریبی، خود غرض انسان معلوم ہونے لگا۔ جس کی موجودہ تہذیب و تمدّن پر فریفتگی ایک کھوکھلی نقّالی تھی۔" اُسے اب تک حسین کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی رہی تھی۔ وہ اُسے اب تک ایک روشن خیال، صحیح معنی میں ترقی یافتہ اور سمجھدار انسان سمجھتی رہی تھی لیکن اب اُس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا تھا۔ وہ اس حالت میں اپنی زندگی کا باقی ماندہ حصہ حسین کے ساتھ کس طرح گذار سکتی ہے۔"

لیکن خالدہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ حسین سے کس طرح علیحدہ ہو جائے۔ اُس کا دماغ کچھ روز تک ایک عجیب کشمکش میں مُبتلا رہا۔ یہاں تک کہ ذہنی کشاکش کے برداشت کی قوت اس میں باقی نہ رہی اور اُس نے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق فیصلہ کر لیا۔ "وہ مدنا پور سے کہیں بہت دُور چلی جائے گی۔"

رات کے بارہ[12] بجے وہ بستر سے اُٹھی۔ اُس نے حسین کے نام خط لکھا اور پو پھٹنے سے قبل دبے پاؤں مکان سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اسٹیشن پہونچ کر

لیٹر بکس میں اُس نے خط ڈالا اور جو پہلی گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی اُسے کلکتہ اور حسین سے دور لے گئی۔

حسین دفتر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اُسے خالدہ کا خط ملا۔ خط مختصر تھا:

"میں تمہاری غایت مشکور ہوں کہ تم نے مجھے ایک گہری غلط فہمی سے نجات دلادی۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کے جو دن گذرے میں نے اُنہیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گویا میری زندگی کا گذشتہ ایک سال مجھے واپس مل گیا ہو اور مجھے پھر اُسے اپنے طور پر گذارنے کا حق حاصل ہو۔ اس سودے کے لئے میں صرف ایک ہی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ یعنی یہ کہ ہمیشہ کے لئے کلکتہ اور وہاں کے تعلقات سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ میرا یہ فیصلہ صرف میرے ہی نجات کا سامان بہم نہیں پہونچائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہیں بھی مطمئن کر دے گا۔"

خط پڑھ کر حسین دفعتًا کرسی پر گر گیا۔ اُس کے دماغ میں متضاد خیالات تیزی کے ساتھ اُبھرنے لگے "خالدہ چلی گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ اپنے جمالی کے پاس گئی ہوگی ذلیل کمینہ انسان! وہ اُسے خاک میں ملا کر چھوڑے گا۔ ٹھیک ہے۔ خالدہ کو اپنے کرتوت کی سزا ملنی چاہیئے۔" اس کے چہرے پر وحشیانہ خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ "لیکن خود اسے بھی اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "خالدہ اُسے رسوائی اور ذلّت کا شکار بنا کر چلی گئی۔ وہ کسی کو کس طرح مُنہ دکھا سکے گا؟ نہیں وہ کمال احتیاط سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔" اس نے فورًا گھر ایک تار روانہ کر دیا:

"خالدہ یہاں آگئی ہے آپ لوگ مطمئن رہیں۔"

خالدہ جب سے کلکتہ سے گئی تھی کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں اُس کی کمی کافی

محسوس کی جا رہی تھی۔ ہر ملاقاتی حسین سے اس کے متعلق سوال کرتا۔ حسین نے لوگوں کے استفسار کے ڈر سے دفتر کے سوا دوسری جگہ آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ خالدہ کے بھاگ جانے کے بعد اس کے لئے دفتر جانا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اسے ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا کہ خالدہ کے غائب ہونے کی خبر دوسروں کو مل نہ چکی ہو۔ کہیں کوئی راستہ میں اس سے اس کی بابت سوال نہ کر دے۔ اس کے کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ "شاید آنے والا اس سے خالدہ کے بھاگنے کا سبب پوچھنے آ رہا ہے"۔ اس نے دفتر سے طویل رخصت لے لی اور مدنا پور چلا گیا۔ گھر والوں پر وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ خالدہ کلکتہ میں ہے۔

حسین کی رخصت ختم ہونے کو آئی۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی قوت اس کو کلکتہ جانے سے روک رہی ہے۔ جیسے کلکتہ جانا اسے کسی ایسی آفت میں گرفتار کر دے گا جس سے چھٹکارا محال ہو۔ "وہ کب تک کلکتہ والوں سے خالدہ کے بھاگنے کا راز چھپائے رکھنے میں کامیاب رہ سکتا ہے۔ آخر یہ راز ظاہر ہو کر ہی رہے گا اور وحشی شعلوں کی طرح سارے کلکتہ میں پھیل جائے گا۔" وہ اپنے آپ کو ان شعلوں میں گھرا ہوا پاتا تھا۔ ان کے مقابلے کی قوت اسے اپنے اندر محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

حسین اب ایک کٹر ملا کی سی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ مذہب کا ایک کورانہ مقلد بن گیا ہے۔ اپنے دماغ کے ہیجان سے اس نے مذہب کی خود فراموشی میں پناہ حاصل کی۔ اسے کہیں اور سکون مل بھی نہ سکتا تھا۔

ساقی جون ۱۹۴۰ء

طوائف

فیروزہ کی ماں نے دوسرا بیاہ کر لیا۔

فیروزہ ماں کے بیاہ سے بہت خوش تھی۔ اس کی ماں نے بیاہ کے قبل اس سے کہا تھا کہ اُسے پھر باوا مل جانے والے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ اچھے۔ اس کا حقیقی باپ اُسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ شام کو کام سے واپس آتا تو پہلے اسے گود میں اُٹھا کر پیار کرتا۔ اسے اپنے ساتھ کھلاتا اور ساتھ سُلاتا۔ اُس کی ماں جب اس کے باپ کی عدم موجودگی میں اُسے پیٹتی تو فیروزہ باپ کے سامنے رونی صورت بنا کر شکایت کرتی۔ اس وقت اس کا باپ اس کی ماں پر بہت خفا ہوتا۔ اور فیروزہ ماں کو باتیں سُنوا کر بہت خوش ہوتی۔ اس کی ماں اسے ایک دم چاہتی نہ تھی باپ کے مرنے کے بعد سے فیروزہ اس کی محبت اور توجہ کی محرومی کے اثر سے شست

رہا کرتی۔ جیسے اس کا کوئی محبوب کھلونا کھو گیا ہو اور اس کا بدل اسے نہ ملا ہو۔ اسے پھر دوسرا باپ ملنے والا تھا۔ "وہ اسے ویسا ہی پیار کرے گا۔ اس کی ویسی ہی خاطر داریاں کرے گا۔ باپ ہے۔ ماں تھوڑی ہی ہے کہ اُسے بات بات پر جھڑکیاں سُنائے اور بے قصور سزائیں دیا کرے۔" اسی طرح کے خیالات کی سی کیفیت فیروزہ کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی جس وقت وہ اپنے نئے باوا کی آمد کی منتظر تھی۔

عبدال گھر میں داخل ہوا تو فیروزہ شوق آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بڑھی۔ لیکن خود بہ خود اس کی نگاہ نیچے کو جھک گئی۔ اور وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی شاید عبدال کی آنکھوں میں اس نے اپنے باپ کی نظروں کا نشان نہ پایا۔ عبدال نے اُسے اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اس کی ماں کے پاس کوٹھری میں چلا گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوتے ہی عبدال نے دروازہ کی کنڈی اندر سے چڑھا دی۔ "باوا نے تو کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا باوا نہیں ہو سکتا۔" فیروزہ کی ماں نے کوٹھری کے اندر سے آواز دے کر اُسے بازو کی کوٹھری میں جا کر سو رہنے کا حکم دیا۔ فیروزہ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ آج تک وہ دوسری کوٹھری میں نہ سوئی تھی۔ "وہ اکیلی کس طرح سوئے گی؟" اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ "میں یہیں سوؤں گی۔" اُس نے ماں کو پکار کر کہا۔

"اچھا لیکن ابھی وہیں جا کر سو رہو۔ میں پھر یہیں لے آؤں گی۔" اس کی ماں نے جواب دیا۔

فیروزہ کا خوف سے قدم نہ اُٹھتا تھا۔ لیکن وہ ماں سے بہت ڈرتی تھی۔ اس کی مار یاد کر کے اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کر سکتی تھی۔ "لیکن باوا نے اُسے کیوں نہیں بُلایا؟ اس کے باوا تو کبھی اُسے اس طرح تنہا نہ چھوڑا کرتے تھے۔ کیا یہ اس کی ماں کے خلاف اس کی پشت پناہی نہ کرے گا؟" وہ ڈرتے ڈرتے دوسری

کوٹھری میں آئی اور کھٹولے پر لیٹ گئی۔ وہ اپنے باپ کی باتیں یاد کر کے ماضی کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔ آدمی کا حافظہ اگر چھین لیا جائے تو بیشتر واقعات و مشاہدات کے زہریلے نشتر اس کے لئے جینا دشوار کر دیں۔ لیکن حافظہ ہماری زندگی کی گذشتہ تلخیاں بھی تو پیش کر سکتا ہے؟ مشکل ہے۔ حافظہ ہماری خواہشوں کا مطیع ہے۔ وہ ہماری خواہشوں کے مشورہ سے زندگی کے مشاہدات کو رد یا قبول کرتا ہے۔ اور واقعات کے سنگریزوں میں ہمارے لئے چمکیلے موتی تلاش کر لیتا ہے۔ فیروزہ کو تھوڑی دیر میں نیند آ گئی۔

فیروزہ کی ماں کو ایک بچی اور ہو گئی تھی۔ فیروزہ کو اسے دن دن بھر گود میں لئے بیٹھا رہنا پڑتا۔ اس کی پیٹھ اکڑ جایا کرتی۔ ایک دن بچی اس کی گود سے زمین پر آ رہی تو عبدال نے اس پر ایسی خشم آلود نگاہیں ڈالیں کہ وہ بید کی طرح لرز گئی "اس نے جان کر اسے نہیں گرایا تھا"۔ اسے ماں سے بھی اس دن سخت جھڑکیاں سننی پڑی تھیں۔

ننھی کے لئے عبدال نئے نئے کپڑے کھلونے اور مٹھائیاں لایا کرتا۔ "یہ کپڑے اور مٹھائیاں اسے کیوں نہیں دی جاتیں؟ اس کا باپ تو سب کچھ اسی کو لا کر دیا کرتا تھا۔" اس کے ننھے سے دل میں عبدال کے لئے نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ اس کے جذبات کی مسلسل ٹھیسوں نے اس نفرت کی نیو طیار کی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نفرت جذبہ سے بڑھ کر ایک مستقل زاویہ نگاہ بن گئی اور فیروزہ کو عبدال کی ہر حرکت میں اپنے ساتھ دشمنی اور ناروا سلوک کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ نفرت کی لازمی پیداوار انتقام کے جذبات، اس کے نرم و نازک دل میں خشونت اور کرختگی کا خمیر تیار کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اسے عبدال کے احکام کی خلاف ورزی میں لذت سی محسوس ہونے لگی اور اس کی حرکتیں اضطراری طور پر ایسی ہوتے لگیں کہ عبدال کی برافروختگی کا شکار بن سکیں۔ اسے تاکید تھی کہ وہ اول تو گھر سے باہر کہیں جائے ہی نہیں، اور اگر

جائے بھی تو بہت جلد واپس ہو جائے۔ لیکن فیروزہ اکثر باہر نکل جاتی اور کبھی کبھی رات ہونے تک واپس نہ آتی۔ اُسے اس کے لئے سخت سزائیں بھگتنی پڑتیں۔

ایک دن جب وہ رات گئے دیر سے واپس ہوئی تھی تو اس کی ماں نے اسے اچھی طرح پیٹ لینے کے بعد اس کے سارے کپڑے چھین کر دروازہ سے باہر کر دیا تھا۔ عبدال اس وقت گھر میں موجود تھا اور فیروزہ کی ماں کی اس نرالی سزا پر داد تحسین دے رہا تھا فیروزہ محسوس کر رہی تھی کہ وہی اس کی ماں کو اُکسا کر اُسے سزا دلوا رہا تھا۔ جس وقت اُس کی ماں نے اسے ننگا کر دیا تھا۔ عبدال اس کے عریاں جسم پر نظر جائے فاتحانہ شان سے مسکرا رہا تھا۔ اس وقت فیروزہ کا جی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالے اور اس کا منہ نوچ لے وہ بظاہر کچھ نہ کر سکتی تھی لیکن اس کے دل میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک منصوبوں کی نیو پڑ گئی۔

فیروزہ جوان ہو گئی۔ خوب صورت تو وہ بچپن ہی سے تھی لیکن شباب نے اس کے اعضا میں بجلی کی حرارت ڈال کر اُن میں غیر معمولی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے میلے چکٹے کپڑے اس کے حُسن پر پردہ ڈالنے کے بجائے اس کی دل کشی کو دوبالا کر رہے تھے جیسے ملگجی بادلوں کی آغوش میں چاند۔ اس کی معصوم نگاہوں میں جادو بھر گیا تھا۔ عبدال کی جھونپڑی میں وہ گودڑ کا لعل معلوم ہونے لگی۔

عبدال کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ وہ فیروزہ کی ماں سے بہت چھوٹا تھا۔ اس کے اندر ابھی جوانی کی حرارتیں باقی تھیں۔ شعلہ کو دیکھ کر شعلہ میں لپک پیدا ہوئی۔ اور عبدال فیروزہ کی جوانی کا شکار ہو گیا۔ لیکن وہ فیروزہ کی ماں سے بہت ڈرتا تھا۔ نچلی سوسائٹی کی عورتیں عموماً مردوں پر حاوی رہا کرتی ہیں۔ انہیں طبقہ اوسط کی طرح مردوں کا محکوم نہیں رہنا پڑتا۔ عبدال کی مجال نہ تھی کہ وہ فیروزہ کی ماں کی واقفیت میں فیروزہ کے ساتھ کسی طرح کا اقدام کر سکتا۔ ممکن ہے گناہ کے تصوّر نے بھی اسے بودا بنا دیا ہو۔

ایک دن عبدال کو اپنے خرمن کی خوشہ چینی کا موقعہ مل گیا۔ فیروزہ کی ماں کچھ دیر کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔ محلہ سے دور کسی بیاہ کی شرکت میں اور کافی دیر سے واپس ہونے والی تھی۔ فیروزہ گھر میں اکیلی تھی۔ عبدال ایسے موقع کی راہ ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ شوق آمیز نگاہیں فیروزہ پر جمائے اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ فیروزہ کو وہ اِن بدلی ہوئی نگاہوں کا عادی بنا چکا تھا ــــــ گو فیروزہ کے لئے اب تک اس کی نظروں کا تغیر ایک معمہ تھا۔

عبدال نے فیروزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کھیلنے لگا۔ پہلے تو فیروزہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ لیکن فوراً اس نے آپ ہی آپ عبدال کے ہاتھ کو ایک تیز جھٹکا دے کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اور پھر اپنی اس گستاخی کی سزاؤں کی منتظر پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن عبدال نے اس کی اس جسارت کا جواب ایک نرم مسکراہٹ سے دیا۔ یہ بالکل انوکھی سی بات تھی۔ فیروزہ کچھ بھی نہ سکی۔ لیکن وہ ایک انبساط کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ شاید اس کے دماغ نے غیر شعوری طور پر محسوس کیا کہ وہ بھی عبدال پر وار کر سکتی ہے۔ عبدال دوبارہ اس کے قریب آگیا اور اس دفعہ اس نے فیروزہ کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے، فیروزہ نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہو سکی، تو اس نے عبدال کے ہاتھ میں اپنے دانت گڑا دیئے۔ عبدال کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اس دفعہ بھی فیروزہ کو کوئی سزا نہ بھگتنی پڑی۔ عبدال نے اس پر پھر حملہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک نمودار ہو رہی تھی اور اس کے اعضاء میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ فیروزہ نے اس دفعہ بھی مدافعت پوری قوت سے کی۔ اس کے گال گلابی ہو رہے تھے جیسے عنابی شراب بلوری پیالہ سے چھلک رہی ہو۔ اس کے قلب کی تیز دھڑکن اس کے سینہ میں ایک دل کش مدوجزر پیدا کر رہی تھی۔ اس کے کپڑے پسینہ سے تر ہو کر اس کے جسم سے چمٹے جا رہے تھے۔ جیسے وہ بھی عبدال کے خلاف اس کی مدد کر رہے ہوں۔

فیروزہ تھک کر زیر ہوگئی۔ اپنی پسپائی محسوس کر کے اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن عبدال نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آخر عبدال نے اس پر قابو پالیا۔ لیکن فیروزہ نے اپنے تیز ناخن کے مسلسل عمل سے اس کے جسم کے اکثر حصوں کو داغ دار بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد عبدال فیروزہ کو ہزیمت اور کامرانی کی متضاد کیفیتوں کا شکار چھوڑ کر گھر سے کہیں باہر چلا گیا اور رات کو بہت دیر گئے واپس آکر بیماری کا بہانہ کر کے چادر اوڑھ کر سو رہا۔ فیروزہ کی ماں کو ان باتوں کا کوئی علم نہ ہوا۔

عبدال نے اکثر اس طرح موقع پاکر اپنی ہوسناکی کی تسکین کی لیکن ہر دفعہ اُسے فیروزہ کی طرف سے شدید مدافعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ فیروزہ اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک سے پیش آتی۔ اُسے طمانچے لگاتی۔ اس کے کان مروڑتی۔ اکثر اسے راز فاش کر دینے کی دھمکیاں دیتی۔ شروع میں فیروزہ کے ہاتھوں اپنی اہانت عبدال کو بری لگتی تھی۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ اگر وہ فیروزہ کے سلوک کا سختی سے جواب دیتا تو ممکن تھا راز طشت از بام ہو جاتا اور اسے فیروزہ سے دست بردار ہو جانا پڑتا۔ جس کی اجازت اس کی ہوس نہ دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ فیروزہ کے برتاؤ کا عادی ہو گیا اور اُسے اپنی خودداری کا کوئی پاس باقی نہ رہا۔ پانی کے قطروں کا تواتر پتھر میں چھید کر دیتا ہے۔ آدمی کا وقار مسلسل ٹھکرانے کے بعد کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ عبدال نے یہ بھی محسوس کیا کہ جب بھی وہ فیروزہ کو بغیر کسی مزاحمت کے اپنی توہین اور سرزنش کا موقع دے دیتا تو حصول مقصد میں اسے آسانی ہو جاتی۔ اس طرح وہ اپنی اہانت سے حصولِ مدّعا کے لئے رشوت کا کام لینے لگا۔

فیروزہ کی ماں نے ایک دن عبدال اور فیروزہ کے تعلقات اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے۔ اس نے چیخ چیخ کر عبدال اور فیروزہ کو کوسنے اور گالیاں دینی شروع کیں اور سارے محلہ کو سر پر اُٹھا لیا۔ عبدال آہستہ سے گھر سے باہر نکل گیا اور فیروزہ کوٹھری میں چھپ کر رونے لگی۔ اس کی ماں دن بھر رونے پیٹنے کے بعد تھک کر شام کو منہ ڈھانک کر

کھاٹ پر پڑ گئی۔

فیروزہ چور کی طرح گھر سے نکل کر کمیا کے گھر جا چھپی۔ کمیا ایک کہنہ مشق بردہ فروش تھی۔ وہ پہلے ہی سے فیروزہ کی گھات میں تھی۔ اُس نے شکار ہاتھ سے جانے نہ دیا اور فیروزہ کو شہر کے چکلہ کے ٹھیکیدار کے ہاتھ فروخت کر کے رات ہی رات بلاس پور سے غائب کرا دیا۔

فیروزہ اب دوسری دنیا میں تھی۔ اُس نے بہت جلد شہر میں کافی شہرت حاصل کر لی اور شیدائیوں کا ایک گروہ اس کی جنبش نظر پر جان سپاری کا ارمان دل میں لئے اس کی دکان کا چکر لگانے لگا۔ پہلے تو فیروزہ اس نئے ماحول سے کچھ گھبرائی سی معلوم ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہوس کی قربان گاہ پر مردوں کی خودداری و وقار، اولوالعزمی و بلند حوصلگی کی بھینٹ میں اُسے مزا ملنے لگا۔ وہ اس حاکم کی طرح مطمئن اور شاداں رہنے لگی جس کی رعایا بڑے سے بڑے مظالم اور ذلیل سے ذلیل تحقیر کے بعد بھی اُف تک نہیں کرتی۔ وہ اپنے ہر نئے خریدار کو جلی کٹی باتیں اور توہین آمیز جملے سناتی۔ اُسے نشانہ غیظ و غضب بناتی اور مختلف عنوان سے اس کی ہتک کرتی۔ وہ اس سے خوشامدیں کراتی، ہاتھ جڑواتی قدموں پر سر رکھواتی اور جب وہ ان ساری آزمائشوں سے پار اُتر جاتا تو غرور و تمکنت کے ساتھ اس کے حق میں اپنی عارضی سپردگی کا فیصلہ صادر کرتی۔ اگر کوئی نووارد ان آزمائشوں کے لئے تیار نہ نظر آتا تو فیروزہ اُس پر قہر و غضب کی نگاہیں برساتی کسی بہانہ سے کمرہ سے اُٹھ کر چلی جاتی۔

فیروزہ اپنے چاہنے والوں میں اپنی سخت کلامی درشتی بداخلاقی اور بے تمیزی کے لئے بدنام ہونے کے باوجود انہیں اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ وہ اس کی جاذبیت کا سبب اس کا غیر معمولی حسن بتاتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ اس کی دل کشی کا راز اس کی درشتی اور سخت کلامی ہی میں مضمر ہو۔ ان کے ذریعہ جذبہ گناہ کے ساتھ تقاضائے

سزا کی تسکین بھی ہو جاتی ہوگی۔

فیروزہ کا رویہ چکلہ کے ٹھیکیدار کو بہت زیادہ ناپسند تھا۔ اُس نے اُسے اکثر نصیحتیں کیں کہ وہ اپنے شیدائیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے لیکن فیروزہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ باوجود اپنی بد اخلاقی کے فیروزہ ٹھیکیدار کے لئے سب سے زیادہ آمدنی کا ذریعہ تھی۔ اس لئے اسے ناچار صبر سے کام لینا پڑتا تھا۔

فیروزہ کے ایک شیدائی نے اپنی ایک مُستقل نشانی اس کے پاس چھوڑ دی۔ فیروزہ آتشک کی شکار ہو گئی۔ پہلے تو وہ اس عارضہ کی اہمیت کو کچھ سمجھ نہ سکی لیکن جب راما نے اس کے خوفناک نتیجے اسے بتائے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "ان سبھوں کو جب اس کی خبر ہو جائے گی تو وہ تمہارے پاس کبھی بھی نہ آئیں گے۔ تمہارا یہ مرض ان کی نسل تک کو برباد کر دے گا۔" فیروزہ یہ سن کر کانپ گئی۔ شاید اس لئے کہ اسے اپنے اقتدار اور حکومت کی بنیاد متزلزل نظر آنے لگی۔ جیسے کسی بادشاہ کی رعایا اُسے تخت سے معزول کر رہی ہو۔ اُس نے راما سے قسمیں لیں کہ وہ اس راز کو کسی پر افشا نہ کرے گی۔ وہ خود بھی اپنے مرض کو پوشیدہ رکھنے میں کامل احتیاط برتتی لیکن اس نے اپنے شیدائیوں کی تسکین آرزو کے مشاغل میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ تعداد کو روز شاد کام کر رہی تھی۔ اس کی اس بڑھتی ہوئی مصروفیت کا اس کی صحت پر نہایت خراب اثر پڑ رہا تھا۔ اس کا مرض الگ اس کے جسم کو گھن لگا رہا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود اس پر ایک سرشاری کی کیفیت طاری رہتی اور اس کے چہرے پر شادابی اور مسرت کی جھلک نمایاں۔ جیسے اس کے کسی نامعلوم دیرینہ جذبہ کی تسکین کا دفعتًا سامان مہیّا ہو گیا ہو۔ اپنے خریدار کی تکمیل ہوس پر وہ ایک پُراسرار قہقہہ میں گم ہو جاتی جیسے وہ اپنی کسی غیر معمولی کامیابی سے لُطف اندوز ہو رہی ہو۔

ساقی افسانہ نمبر جولائی ۱۹۴۰ء

احساسِ گناہ

جمیل گرمیوں کی چھٹیاں گھر پر نہایت بے کیفی کے ساتھ گذار رہا تھا۔ کہاں ہوسٹل کا دلچسپ اور ہنگامہ پرور ماحول اور کہاں حسین گنج کی سنسان اور پُرسکوت فضا۔ اس کا وقت یا تو اپنے والد ماجد کی مذہبی تلقین اور اخلاقیات کے لکچر سننے میں گذرتا یا گھر کے اندر عورتوں کے آگے شہری زندگی کی دلچسپیوں اور اپنے کالج کے کارناموں پر تبصروں میں۔ سکینہ اس کی گفتگو میں بہت زیادہ دلچسپی لیا کرتی۔ وہ اکثر پہروں بیٹھا اُسے آپ بیتی اور جگ بیتی سنایا کرتا۔ سکینہ اس کی دور کی رشتہ دار تھی۔ سکینہ کی ماں کمسنی میں بیوہ ہوگئی تھی اور شوہر کی موت کے بعد سے ناداری اور غربت کی شکار ہوکر جمیل کے گھر ایک معزز ماما کی حیثیت سے زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ سکینہ جمیل سے صرف چند ہی سال چھوٹی تھی۔

دونوں بچپن سے ساتھ کے کھیلے تھے اور اسکول میں داخلہ کے قبل تک جمیل سکینہ کا ہم مکتب بھی رہا تھا۔ آپس میں غایت بے تکلفی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو نام لے کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سکینہ نے مکتب کا سلسلہ تو عرصہ ہوا چھوڑ دیا تھا لیکن پڑھنے لکھنے کا ذوق اُسے باقی تھا۔ جمیل چھٹیوں میں گھر آتا تو اس کے لئے کچھ کتابیں اور رسالے ساتھ لیتا آتا اور اس طرح سکینہ کی علمی صلاحیتوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

جمیل اپنی عمر کا اٹھارہواں سال ختم کر چکا تھا۔ شباب کی کیفیتیں اس میں رونما ہو چلی تھیں۔ گو ان کا اثر ابھی پورے طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ وہ طفولیت کے سرحد سے باہر ہوا ہی چاہتا تھا اور جوانی دبے پاؤں اس کے استقبال کو بڑھ رہی تھی۔ طفولیت کا استغنا اور اطمینان رفتہ رفتہ ایک بے معنی اضطراب اور مبہم جستجو کی کیفیت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹھہری ہوئی زمین اس کے پیر کے نیچے سے دفعتاً سرکنے لگی ہو، اور اس کے قدموں میں ڈگمگاہٹ سی پیدا ہو رہی ہو۔ اپنے اندر ان رونما ہونے والے انقلابات کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ ہاں اس دفعہ اس کا جی گھر سے کچھ بہت زیادہ اُکتایا سا تھا۔ اور اپنے ماحول سے وہ کچھ بیزار سا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے اعضا متحرک ہونے کو بے چین ہوں۔ لیکن سامنے راستہ مسدود نظر آئے۔ اس کا دل چاہتا ہو کہ وہ سارے دن دیہات کے وسیع میدانوں میں دوڑتا پھرے اور جب تھک جائے تو فضا کے سکوت کو اپنی بلند تانوں سے چیر چیر ڈالے۔ لیکن تہذیب و تعلیم کا ذہب اُسے ان حرکتوں کی اجازت نہ دیتا ہو۔

سکینہ بھی شباب کے نصف النہار کے قریب پہونچ رہی تھی، جب کائنات کی رنگینیاں ایک لمحہ کے لئے سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو جاتی ہیں۔ دیہات کی سادہ اور معصوم فضاؤں کی پروردہ ہونے کی وجہ سے وہ شباب کی فتنہ سامانیوں میں تو ڈھل گئی تھی لیکن شباب کی، ہشیاریوں سے محض بیگانہ تھی۔

جمیل سے اُسے کسی قسم کا حجاب نہ تھا اور وہ اب بھی اس کے پاس اسی بے باکی اور الھڑ پن سے بیٹھی باتیں کیا کرتی جیسے چند سال قبل، جمیل کو بھی اس کی محشر بداماں کا احساس نہ پیدا ہوا تھا نہ اسے سکینہ کی آواز میں نقرئی گھنٹیاں بجتی ہوئی سُنائی دیتی تھیں نہ اس کی صورت میں 'کنول' کا کھلتا ہوا پھول دکھائی دیا تھا۔

ایک دن جمیل کی طبیعت بہت زیادہ گھبرانے لگی اور وہ گھر میں آکر سکینہ کے ساتھ گفتگو میں اپنے کو بہلانے لگا۔ ہمسایہ میں شادی کی تقریب تھی اس لئے گھر میں سکینہ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہو چلا تھا۔ پورب کی بوجھل ہوا ایک بدمست شباب کی طرح جھومتی پھر رہی تھی۔ ساری فضا مستی اور خود فراموشی میں غرق معلوم ہوتی تھی۔ جیسے بدی کی قوتوں نے کائنات سے سازش کر رکھی ہو۔ معصوم دماغوں کی تہ میں بھی گناہ کی مُردہ ترغیبات کو جام حیات بٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے تاریکی روشنی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو رہی ہو۔

جمیل اور سکینہ گفتگو کی دل چسپیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ گھر میں کامل سناٹا تھا۔ جمیل کے والد حسب معمول مغرب سے مصلے پر بیٹھے اپنی جبین نیاز پہ تقدس مآبی کا نقش چمکانے میں مصروف تھے۔ رات رفتہ رفتہ بھیگتی جا رہی تھی، اور سکوت زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اوائل مہینہ کا اُداس اور پھیکا چاند اپنی مدھم روشنی سے فضا میں ایک دھندلکا سا پیدا کر رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے جمیل کے انداز میں دفعتاً ایک نمایاں "تغیر" پیدا ہونے لگا۔ جیسے وہ یکبارگی کسی نامعلوم جذبہ سے مغلوب ہو گیا ہو۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہونے لگی اور اعضا میں کپکپی، جیسے وہ سردی کے دنوں میں بغیر گرم کپڑے پہنے بیٹھا ہو۔ اس کے قلب کی حرکت نمایاں طور پر تیز ہونے لگی۔ اور اس کی نظریں سکینہ کے خوب صورت سڈول جسم پر چپک سی گئیں۔ سکینہ پر اضطراب اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اندھیری رات - محیط سنّاٹا، جمیل کی جوانی، اس کا مردانہ حُسن، موقعہ کی نزاکت
یہ ساری باتیں جیسے کسی نے اس کے کان میں پھونک ڈالیں۔ جمیل کے سامنے پہلی بار اُسے
حجاب محسوس ہوا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی جیسے کسی آنے والے حادثہ کے مقابلہ کو تیّار
ہو رہی ہو۔ ساری کا آنچل جو دیر سے سرک کر کاندھے پر آ رہا تھا اس کے سر پہ پہونچ
گیا۔ اور اس کی نگاہیں آپ ہی آپ فرش پر جم گئیں۔ جمیل نے دفعتاً اس کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لے لیا۔ سکینہ کے سارے جسم میں لرزا پیدا ہو گیا۔ اسے تیز گرمی سی معلوم ہونے
لگی اور اس کی درخشاں پیشانی پر پسینوں کے ستارے چمکنے لگے۔ جمیل نے اسے
یکبارگی بھینچ کر اپنی آغوش میں کر لیا۔ چاند ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی ماتمی صف
سے دفعتاً روپوش ہو گیا۔ اور کائنات پر تیرگی کا عَلم لہرانے لگا۔

جمیل کی چھٹیّاں ختم ہو گئیں اور وہ کالج واپس چلا گیا۔ سکینہ اپنی صحت
میں غیر معمولی انحطاط محسوس کرنے لگی۔ اس کی طبیعت نڈھال سی رہتی۔ کسی کام میں
جی نہ لگتا۔ پہلے تو اسے ان ساری باتوں پر اچنبھا سا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ
بعد اس کے دماغ پر ایک تلخ حقیقت اُبھرنے لگی جس کے نوکدار نشتر رفتہ رفتہ اس
کے دماغ میں پیوست ہونے لگے، وہ بچّے کی ماں بننے والی تھی۔ اس خیال سے
سکینہ لرز اُٹھی۔ "اس رسوائی سے پہلے وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالے گی۔" اس
نے فاتحانہ انداز میں سوچا۔ لیکن زندگی کی خواہش اس فیصلہ کے رستہ میں حائل ہو گئی
اور وہ اس مصیبت سے نجات کی تدبیروں پر غور کرنے لگی۔ "کیا جمیل اسے
اس رسوائی سے بچا سکتا ہے۔" لیکن کس طرح۔ جمیل کی اس سے شادی
اُسے ایک ناممکن سی بات نظر آتی تھی۔ جمیل اپنے والدین کا اکلوتا اور وہ ایک
نادار بیکس بیوہ کی لڑکی۔ "تو پھر وہ کیا کرے گی۔ کاش جمیل کو کسی طرح
اس کی خبر ہو سکتی!" اس نے سوچا کہ جمیل کو خط لکھے۔ لیکن اُسے جرأت نہ ہو سکی۔

اس نے جمیل کو کبھی خط نہ لکھا تھا۔ وہ گھر والوں کی نظروں سے چھپا کر اسے خط کس طرح لکھ سکتی تھی۔ اور پھر جمیل اس کی مدد کر کس طرح سکتا تھا۔ جمیل کا باپ نہایت توہم پرست اور کٹر مذہبی خیال کا تھا۔ وہ ایک منٹ کے لئے اپنے خاندان کی ذلت اور تشہیر برداشت نہ کر سکتا تھا۔

سکینہ کے چہرہ کا گلابی پن رفتہ رفتہ پھیکا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کے کشیدہ قامت میں کجی نمودار ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا شباب یکبارگی میٹھی نیند سے چونکا دیا گیا ہو اور اس سے اذن رخصت لے رہا ہو۔ گھر والوں کو بھی اس کی صحت کے اس انقلاب پر تعجب ہو رہا تھا۔ کاش وہ انہیں اس کا سبب بتا سکتی۔ اس کا بس چلتا تو جوار بھاٹے کی طرح اپنے دل کا بخار ان سب کے آگے نکال ڈالتی۔ وہ اس کشاکش سے نجات حاصل کرنے کی ہزاروں تدبیریں سوچتی لیکن ساری کی ساری اُسے کھوکھلی اور بے معنی نظر آتیں۔

آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی خبر کسی طرح جمیل تک پہونچا دے گی۔ لیکن جب کبھی جمیل کو خط لکھنے کے لئے قلم اُٹھاتی تو اس کے ہاتھ میں رعشہ سا پیدا ہونے لگتا اور ایک حرف لکھنا مشکل ہو جاتا۔ مسلسل کوششوں کے بعد اس نے آخر ایک دن اپنے اوپر قابو حاصل کر لیا۔ اس نے خط لکھنا شروع کیا۔ صرف دو سطر تحریر کر سکی اور وہ بھی نامکمل:

"میں اپنے گناہ کی سزا جلد بھگتنے والی ہوں۔ بے انتہا رسوائی اور ذلت کی شکار ہو کر۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے ساتھ آپ بھی ......"

جمیل کی ماں جمیل کے نام خطوط سکینہ سے لکھوایا کرتی تھی۔ سکینہ نے لفافہ بند کرتے ہوئے اپنا پُرزہ بھی اس کے اندر ڈال دیا۔

جمیل اپنے کمرہ میں بیٹھا اپنی گذشتہ لغزش پر پشیمان ہو رہا تھا۔ اس کی

طبیعت فطرتاً نہایت حساس واقع ہوئی تھی۔ باپ کے ابتدائی اثر سے اس کے
دماغ میں اخلاق اور مذہب کے نہایت سخت اور مستحکم اصول راسخ ہو گئے تھے
وہ جب سے گھر سے آیا تھا گناہ کا بھیانک تصوّر اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ڈاکیہ
نے گھر کا خط اس کے ہاتھ میں لا کر دیا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ ماں کا خط پڑھنے
سے پہلے سکینہ کے پُرزہ پر اس کی نظر پڑی۔ تحریر کا مطلب ایک باریک نشتر کی طرح
اس کے دماغ میں چبھ گیا۔ لفافہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گیا
اس کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ تھوڑی دیر کے لئے سکتہ کی عالم میں ہو گیا۔ اس کا چہرہ
سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے کسی نے پچکاری کے ذریعہ اس کے جسم کا سارا خون کھینچ لیا ہو۔
انفعال اور ندامت کے تاثرات، ہراس اور خوف کا نیلاپن، اس کے چہرہ کی دلکشی
اور فطری شگفتگی پر بے رونقی کا نقاب ڈال رہا تھا۔ جیسے کسی مصوّر کے شاہکار پر
کسی نے پھیکی روشنائی گرادی ہو۔ اس کا گناہ اس کی نظروں میں کائنات کی عظیم الشان
وسعتوں پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار سے اس کے اوپر لعنت
اور تحقیر کی بوچھار ہو رہی ہے۔ جس کے بوجھ سے اس کے لئے سر اُٹھانا دوبھر ہے۔ وہ
دیر تک اس کیفیت کا شکار رہا۔ پھر یکایک اُسے اپنے گناہ کی مکافات کی فکر ہونے
لگی۔ "اسے سکینہ کو آنے والی مصیبت کے مُنہ سے نکالنا چاہئے۔ خواہ اُسے کیسی ہی
دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔" لیکن وہ اپنے آپ کو بالکل بے دست و پا محسوس
کرتا تھا۔ "سکینہ سے اس کی شادی ناممکن! اس کے والد کبھی اس پر آمادہ نہیں
ہو سکتے۔ خصوصاً اس کی ماں۔ وہ کیسے راضی ہو سکتی تھی۔ اس کے دل میں حوصلوں
اور تمنّاؤں کا ایک دریا اُمڈ رہا تھا۔ اُس نے کس ارمان سے اس کی منسوب اپنی بھانجی
سے کی تھی۔ منگنی کی تقریب کس شوق سے رچائی تھی اور وہ کس بے چینی سے اُسے
بہو بنا کر گھر میں لانے کے دن گن رہی تھی۔ اس کی امیدوں کا خون ہو جائے گا۔
اس کے ارمان کچل جائیں گے۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اس پر حسرت و

اندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ ہرگز اس کی تاب نہ لا سکے گی۔" اس کی پیاری چاہنے والی ماں" اس کی ماں کا معصوم بوڑھا چہرہ جمیل کی نظروں کے سامنے آگیا اس سے اُداسی اور التجا نمایاں ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ بیٹا میں نے اپنی محبت تجھ پر اسی لئے نچھاور کی تھی کہ تو میرے ارمانوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالے۔ میرے میکہ والوں کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے بدظن کر دے۔ مجھے اپنے بھائی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھے۔ میری بھانجی کی زندگی برباد کر دے"۔ جمیل لرز گیا۔ میں ایسا کس طرح کر سکتا ہوں۔ تو کیا میں سکینہ کو بربادی اور ذلت کی تاریکی میں اکیلا چھوڑ دوں؟ کاش مجھ سے یہ لغزش ہی نہ ہوئی ہوتی۔" اسے اپنے اوپر نفرت سی آنے لگی۔ اپنی زندگی اسے کائنات کے دامن کا ایک بدنما دھبہ معلوم ہونے لگی۔" اس دھبّے کو دُھل جانا ہی چاہیئے۔" اس کے دماغ میں خودکشی کے دُھندلے احساسات اُبھرنے لگے۔ اُسے نیند آ گئی۔ اور وہ دیر تک ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

جمیل کا دماغ ایک مستقل کشاکش کی منظر گاہ بن گیا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ قطعاً معطل ہو رہی تھی۔ اس کی طبیعت کسی کام پر جمتی نہ تھی۔ وہ کلاس میں جا کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ لیکن کلاس کے وجود کا اُسے کوئی علم نہ ہوتا۔ لیکچرار اور کلاس کے ساتھیوں کی صورتیں اسے فضا میں گھل کر مہیب شکلیں اختیار کرتی ہوئی معلوم ہوتیں جن سے نفرت اور استہزا آشکار ہوتا رہتا۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ کمرہ میں چلا جاتا اور اندر سے دروازہ بند کر کے ذہنی سمندر کے مختلف دھاروں پر بہنے کے لئے اپنے آپ کو چھوڑ دیتا۔ اس کے ساتھی سمجھتے کہ وہ امتحان کی تیاری میں منہمک ہے۔

" اس دفعہ کیا یونیورسٹی میں اوّل ہونے کی ٹھان لی ہے۔؟" اصغر نے ہنستے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

" نہیں نہیں یونیورسٹی کا ریکارڈ بیٹ کریں گے۔" حامد نے جمیل کی طرف سے جواب دے دیا۔

"میاں کبھی کبھی دماغ کو باہر کی ہوا بھی کھلا دیا کرو۔ کہیں امتحان آتے آتے پرزے ڈھیلے نہ پڑ جائیں۔" رشید نے کہا۔

جمیل ان کو کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ اس کا ٹھٹھا کر رہے تھے۔ اُسے اس کا احساس تھا۔ لیکن وہ انہیں حق بجانب سمجھتا تھا۔

سکینہ جمیل کے جواب کے انتظار میں صبح سے شام کر رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ جمیل جواب دے گا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جمیل جواب میں لکھے گا کیا۔ جمیل اسے بے قصور اور بے بس نظر آتا تھا۔ وہ اُسے آنے والی مصیبت سے کس طرح نجات دلا سکے گا۔ لیکن پھر بھی اسے امید تھی کہ جمیل اس مصیبت کے مُنہ سے اُسے نکال لے گا۔

سکینہ کو خط لکھے کئی دن گذر گئے۔ جمیل کا جواب نہ آیا۔ لیکن وہ اب تک منتظر تھی۔ ہاں جیسے جیسے دن زیادہ ہوتے جاتے تھے، اس کی امید میں ضعف پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے اس کی اُمید شباب پر پہونچ کر رفتہ رفتہ انحطاط کی طرف مائل ہو رہی ہو۔

سکینہ کی صحت تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ دق کے مریض کا سا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی غریب شکستہ دل ماں اس کی حالت سے بہت زیادہ متاثر ہو رہی تھی۔ سکینہ ہی اس کا سرمایہ حیات تھی۔ اس کی تاریک زندگی کے پس منظر میں ایک چمکتا ہوا ہیرا۔ اس ہیرے کو اپنی آب کھوتا ہوا دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے جمیل کی ماں سے لرز کر کہا۔ "سکینہ کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ جمیل کا صدقہ اس کے علاج کی کوئی تدبیر کرو۔"

جمیل کی ماں نے جمیل کے باپ سے کہہ کر دوسرے دن صبح کو حکیم کو بلوانے کا انتظام کر دیا اور سکینہ کو، حکیم کو دکھلانے کے لئے قارورہ رکھنے کی ہدایت کر دی۔

حکیم کا نام سُن کر سکینہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ "انہیں حکیم جی نے ہاجرہ کو نبض پر ہاتھ رکھتے ہی بتا دیا تھا کہ حمل ہے۔" وہ کانپ اُٹھی۔ حکیم جی اس کے سینہ میں اپنا آہنی چنگل ڈال کر اس کا راز اس سے چھین لینے والے تھے! ساری دنیا میں طشت ازبام کرنے کے لئے۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔" ایک زبردست آواز اس کے دماغ میں گونج گئی۔ معاً اس کی نظر طاق پر رکھی ہوئی آیوڈین کی بھری شیشی پر پڑی جمیل کے باپ نے اسے وقتی ضرورتوں کے لیے شہر سے حال میں منگوایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شیشی زندگی کے روگ کی مسیحائی کا اثر بھی رکھتی ہے۔ اس کے زرد بے رونق چہرہ پہ انبساط کی لہریں دوڑ گئیں۔ جیسے سوکھے ہوئے کھیت پر بارش کے قطروں نے ہری ہری لکیریں کھینچ دی ہوں۔

سکینہ نے خودکشی کر لی! جمیل کو باپ کے خط سے اس کی اطلاع ملی۔ وہ غش کھا کر زمین پر گر گیا۔ تھوڑی دیر میں اُسے ہوش آ گیا۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوا کہ موٹی موٹی آہنی زنجیریں اس کے جسم کے چاروں طرف غلاف کی طرح بن دی گئی ہیں اور وہ اپنے ہاتھ پیر کو جنبش تک نہیں دے سکتا۔ عجیب اور تیز دھاروں والے نوکیلے ہتھیار چاروں طرف سے اسے نشانہ بنائے اس کے قریب بڑھتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ خوف سے چلانے لگا۔ بازو کے کمروں کے لڑکے اس کی چیخ سن کر دوڑے اور جمیل جمیل پکارتے کمرہ میں گھس آئے۔ جمیل نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانک لیا اور مسلسل چیخیں مارنے لگا۔ لڑکوں نے اس کے چہرہ سے ہاتھ ہٹانے کی سخت کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مقناطیس سے لوہا چمٹ گیا ہو کالج بھر میں ایک ہنگامہ ہو گیا اور جمیل چند لڑکوں کی معیت میں گھر پہونچا دیا گیا۔ گھر پہونچ کر جمیل کی کیفیت میں کوئی فرق نہ پیدا ہوا۔ ہاں اس کی چیخیں رفتہ رفتہ بند ہو گئیں یہاں تک کہ اس کے لبوں پر ایک مستقل مہر سکوت ثبت ہو گئی۔

شکستِ عزم

خیالات کی تیز رَو میں کھوئی ہوئی شانتی رُکتے ہوئے قدموں سے
زینہ پر چڑھ رہی تھی۔ زینہ کی موڑ پر وہ دیوار سے ٹکرائی اور بلیرڈ کی گیند کی طرح
اس کا رُخ زینہ کی سمت پھر گیا اوپر پہنچ کر وہ کمرہ کے قفل میں جھبہ کی مختلف
کنجیاں یکے بعد دیگرے گھمانے لگی جیسے اسے تالہ کی اصلی کنجی کا علم نہ ہو۔

"کیسی متانت اور سنجیدگی ہے جگندر میں۔" شانتی انٹر-یونیورسٹی ڈیبیٹ
سے جگندر کی تقریر سُن کر واپس آ رہی تھی۔ جگندر کی قابلانہ گفتگو اور دوسری
معنوی خصوصیتیں اس کی ظاہری سادگی اور بے اثری کے درمیان اُن ستاروں کی
طرح درخشاں اور دلآویز معلوم ہو رہی تھیں جو کالی راتوں میں بادلوں کی سیاہ
نقاب سے کبھی کبھی باہر نکل آتے ہیں۔

شانتی اپنے اندر جگندر کے لئے ایک بے پناہ کشش محسوس کر رہی تھی جگندر کی غیر معمولی صلاحیتیں اس کے شاندار مستقبل کی بابت نت نئی پیشین گوئیاں کرتی رہتی تھیں۔ شانتی خود کو اس کی چمکیلی قسمت کی شریک محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی بلند پہاڑی پر کھڑی غانخانہ شان سے مُسکرا رہی ہو۔ وہ اس تصوّر سے دیر تک لذّت گیر نہ ہو سکی ۔۔ "جگندر تو جذبات و محسوسات سے قطعاً عاری ہے۔ خالص ایک مجسمہ فکر۔ ازدواجی زندگی کی صلاحیتیں تو اس کے اندر مُردہ سی معلوم ہوتی ہیں۔" شانتی کے دماغ میں جگندر کے متعلق دھندھلے شبہات پیدا ہونے لگے تھے جیسے کسی خوبصورت چہرہ پہ چیچک کے دانے اُبھرنے لگے ہوں۔ جگندر اسے سنگ مرمر کے اس بت کے ایسا معلوم ہونے لگا جس کا کمال صنعت اور جس کی فریب کارانہ تراش ایک نوخیز دوشیزہ کے اُمنگوں بھرے دل میں بے ساختہ جذبۂ ہم آغوشی و شوق تکلّم پیدا کر دیتی ہے لیکن دوسری ساعت میں اس کی سرد مہری اور بے زبانی اسے ناقابل اعتنا بنا کر دوشیزہ کی رس بھری آنکھوں میں بے توجہی اور حقارت کی تلخی بھر دیتی ہے۔ وہ اپنے خوب صورت کُتّے کو گلے سے لگا لیتی ہے اور اس کی گرم گرم سانسوں کی مَس سے بے خود ہو کر اس کا مُنھ چومنے لگتی ہے۔ سریش کی مشتاق نگاہیں اس کی محسوسات کی دنیا میں ہلچل مچا دینے والی مُسکراہٹ، شانتی کے دماغ پر محیط ہونے لگی۔ سریش اسے زندگی کی ایک مکمل تصویر معلوم ہونے لگا جس کے اندر وہ ایک نہ مٹنے والی حرارت ایک مستقل حرکت کا عمل دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے مغز گفتگو میں شہد کی مٹھاس اس کی بے معنی نگاہوں میں ستارہ کی چمک۔ سریش اسے ایک پھول کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو سراسر بے مصرف ہوتے کے باوجود اپنے اندر دل کشی کی ایک دنیا سمیٹے ہوتا ہے۔ "وہ سریش کو اپنا شریکِ زندگی بنا کر حیات کے پُر اسرار خزانوں پر دسترس حاصل کر سکتی تھی۔" سریش اس کی پرستاری کرتا تھا۔

وہ کب سے اس کے مُنھ سے "ہاں" سننے کا منتظر تھا۔ لیکن یکبارگی سریش اسے اپنی نظروں میں گرتا ہوا معلوم ہوا۔ اس خوب صورت پھول کی طرح جس کی ناخوشگوار بو اسے دُور ہٹا دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ سریش تمکنت اور وقار کے مردانہ جوہر سے یکسر خالی ہے۔ اس کے دماغ میں اُلجھن سی پیدا ہونے لگی۔

غلط کُنجی تالہ میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ شانتی اسے نکالنے کی کوشش میں خیالات کی رو سے الگ ہوگئی۔ کنجی بُری طرح اٹک گئی تھی۔ شانتی نے نوکر کو آواز دی۔ جمن اپنی چُٹکی میں کنجی پکڑے زور کرنے لگا۔ اس کے کھلے ہوئے سڈول بازو کے پٹھے تن رہے تھے اور ان میں ایک دلآویز خم اور بالیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک یونانی سنگتراش کا شاہکار 'صحت' شانتی کو یاد آنے لگا۔ سریش کے کمرہ میں اکثر اُس نے مشتاق نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا اس کے تصور میں جمن کے بازو ایک دوشیزہ کے گلے میں حمائل معلوم ہوئے اس خیال سے اس کے دماغ میں انفعال کی ایک ہلکی کیفیت پیدا ہوگئی۔ کمرہ کھُل گیا۔ شانتی تھکے ہارے مزدور کی طرح اپنے بستر پر گر گئی۔

شانتی الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔ اے کے آخری سال میں تعلیم پا رہی تھی۔ جگندر اور سریش اس کے کلاس کے ساتھی تھے۔ جگندر یونیورسٹی کا ایک قابل فخر طالب العلم تھا۔ وہ میٹرک سے اب تک یونیورسٹی میں اوّل ہوتا آیا تھا۔ اور ہر امتحان میں یونیورسٹی کے پچھلے ریکارڈ پر سبقت لے گیا تھا۔ سریش ایک نہایت خوش وضع، سوشل اور خوب صورت نوجوان تھا۔ یونیورسٹی کی بیرون کلاس سرگرمیوں میں سب سے آگے رہتا۔ اور اس بنا پر یونیورسٹی بھر میں اس کی شخصیت کو ایک خاص امتیاز حاصل ہوگیا تھا۔

شانتی موجودہ طبقہ نسواں کی ایک کامیاب پیداوار تھی۔ عورت کی

تعلیم و تربیت کا مقصد اس کے نزدیک صرف مردوں کی نقالی نہ تھا بلکہ صحیح معنی میں ذہنی ارتقاء اور پرورش۔ اسے اعتراف تھا کہ مرد تعلیم اور کلچر میں عورتوں سے بہت آگے تھے وہ مرد کو احترام کی نظروں سے دیکھتی اور اس کی صحبت سے بہرہ مند ہونے کی خواہش مند رہتی۔ وہ اپنے مرد ساتھیوں سے کالج کے باہر اکثر ملاقاتیں کرتی اور علمی گفتگو اور مباحثہ میں ان کے ساتھ برابر کا حصّہ لیتی۔ لیکن مردانہ شخصیت کی دلدادہ ہونے کے باوجود، شانتی اپنے سینہ میں ایک عورت کا دھکتا ہوا دل رکھتی تھی جس کی دھڑکن اس کی عملی زندگی کے ہنگاموں میں کھوئی رہتی تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنے علمی مشاغل میں ایک بے کیفی سی محسوس کرتی اور اسے اپنے ماحول سے بیزاری سی ہونے لگتی اس کا جی چاہتا کہ وہ سعی وعمل کی زندگی سے کہیں دور بھاگ جائے کسی ایسے عالم میں جہاں اسے کامل آزادی حاصل ہو۔ خیالات کی دنیا میں کھو جانے کے لئے نہیں بلکہ جذبات و محسوسات کی بے پناہ وسعتوں میں سما جانے کے لئے، اُسے ایک ساتھی کی تلاش محسوس ہونے لگتی جس کے نعروں کا شور اس کے دل کی خموش دھڑکن میں ایک مستقل زیروبم پیدا کر دے، جس کی سانس کی گرمی اُن کے سینے کی بجھتی ہوئی آگ میں شعلے بھڑکا دے جس کے بدن کا مس اس کے جسم کو پھونک کر خاکستر بنا دے فضا میں آزاد بکھرنے کے لئے۔ اس کا دل تڑپنے لگتا، اس کے دماغ کا سکون چھن جاتا، اس کی آنکھ کی نیند اُچاٹ ہو جاتی، جب کبھی ان خیالات کا دھندلکا اس کے دماغ پر پھیلنے لگتا۔ پھر اسے اپنے اوپر نفرت سی آنے لگتی۔ "اُف وہ کیسے ادنیٰ اور ذلیل جذبات کا شکار ہو رہی تھی۔" وہ سارے بدن سے کانپ اُٹھتی۔ "اسے دنیا میں کیا کیا کرنا ہے۔ اس کی زندگی طبقہ نسواں کے لئے شمع ہدایت بننے کو ہے۔ جس کی تقدیر بدلنے کا اُس نے بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ ایک جذباتی انسان رہ کر وہ یہ سب کچھ کس طرح کر سکتی ہے؟"

یہی وجہ تھی کہ اس نے جگندر کو اپنا شریک زندگی منتخب کر لیا تھا۔ جگندر ہی

اس کے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں اس کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ خود جگندر کو طبقہ نسواں سے صرف ہمدردی ہی نہ تھی بلکہ اسے بھی اس کا اعتراف تھا کہ عورتیں مرد کے ہاتھوں بڑی بے انصافی کا شکار ہوئی ہیں اور وہ مرد کے دامن سے اس بدنما دھبّہ کو مٹانا اپنی زندگی کا اولین فرض تصور کرتا تھا۔

شانتی اکثر سوچتی کہ وہ اشارتاً جگندر کو اپنے انتخاب کی خبر کر دے لیکن وہ عورت تھی، ہندوستانی لڑکی۔ جس کی ماں اب تک اپنی شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ شانتی کے لب نہ کھلتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جگندر اس کی بابت پہل کرتا لیکن اسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے جگندر کے دماغ میں یہ خیال پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ اسے جگندر پر آپ ہی آپ غصّہ آنے لگا۔ "شاید جگندر اس قسم کے جذبات سے قطعاً عاری ہے۔ تو پھر وہ اس سے شادی کر کے کیا کرے گی۔؟" اسے ایک ٹھیس سی لگتی لیکن اس کے مقاصد کی تصویریں اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگتیں، اس کے تصور کی شاہکار فردوسی تصویریں، ہر طرح کے نقائص اور عیوب سے مبرا۔ ان تصویروں سے ایک شراب سی چھنتی ہوتی جس کے نشہ میں وہ سب کچھ بھول جاتی، اپنی نسوانی فطرت کی ساری کمزوریاں۔

شانتی آرام کرسی پر دراز جگندر کا افسانہ 'شادی' مادھوری کے تازہ سالانہ نمبر میں پڑھ رہی تھی۔ جگندر کا لکھا ہوا شاید ہی کوئی افسانہ شانتی کی نظر سے نہ گذرا ہو۔ وہ ان کی بے حد دلدادہ تھی۔ اس کی نگاہ میں جگندر ہندوستان کا بہترین افسانہ نگار تھا۔ جگندر کے افسانوں میں اس کی شخصیت کا عکس ہوتا۔ وہ افسانہ لکھنے بیٹھتا تو اس کے سامنے نہ تو کوئی قصّہ یا پلاٹ ہوتا نہ سماج کی اصلاح کے لئے کوئی چلتا ہوا جادو۔ اس کے دماغ میں ایک تخیل پیدا ہوتا وہ قلم ہاتھ میں لے کر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا۔ وہ اس تخیل کو کسی وضع شدہ سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش نہ کرتا وہ اسے اپنے لئے ایک نیا قالب تعمیر کرنے کی غرض سے آزاد چھوڑ دیتا۔ تخیل کی روح

مادی شکل وصورت اختیار کرلیتی اچھوتی مگر سادہ! افسانہ تیار ہو جاتا۔ نہ اس
میں پلاٹ کی پیچیدگی ہوتی نہ گنے چنے اور جالو جذبات وکیفیات کی ترجمانی۔
اسی سبب سے جگندر کے افسانے عام پسند نہ ہوتے تھے۔

شانتی نے افسانہ کی چند سطریں پڑھ کر افسانہ الگ ڈال دیا اس کا دماغ رسالہ
پر جماتا نہ تھا۔ شادی کا عنوان اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ سطر کی سطر سمٹ کر
"شادی" کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ جگندر کے سامنے اپنے ارادہ کا
اظہار کس طور سے کرے۔ اسے یقین تھا کہ جگندر کے دل میں بھی ویسی ہی خواہش پوشیدہ
تھی لیکن جگندر کی متانت اور سنجیدگی اس کے اظہار سے اُسے روک رہی تھی۔ "وہ
ہر لش کی طرح جذبات کا غلام تو نہ تھا ایسی صورت میں خود اس کی طرف سے شہ پائے
بغیر وہ کچھ کہنے کی جراٗت کس طرح کرسکتا تھا"۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ کسی صورت سے
جگندر کو اظہار مدّعا کا موقع دے گی۔ اس کے افسانہ پر تبصرہ کے بہانہ اپنا معیار
انتخاب اس کے سامنے پیش کر کے وہ چھپے لفظوں میں اس کے کان تک اپنے
دل کی بات پہنچا دے گی۔

شانتی نے جلدی جلدی جگندر کا افسانہ شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔
آج پہلا موقع تھا کہ جگندر کے افسانہ میں اُس کا جی نہ لگ رہا تھا اور وہ اپنی
طبیعت پر دباؤ ڈال کر اُسے پڑھ رہی تھی۔ اسے افسانہ سے کام لینا تھا۔

شانتی اس دن شام کو جگندر سے ملی۔ اسے کھلے لفظوں میں اظہار مدعا
کرنا پڑا جس کے لئے وہ تیار نہ تھی اور اس وجہ سے اُسے کچھ پشیمانی بھی ہوئی
جگندر مطلب کی طرف آتا ہی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوران گفتگو میں ایک
بار بھی اس نے شانتی کے قلب کی تیز حرکت اور سانس کی سبک رفتار کو محسوس
نہ کیا جیسے وہ کوئی کتاب سامنے رکھے مصنف کے خیالات سے اپنے کسی نظریہ کا
موازنہ کر رہا ہو۔ ہاں شانتی کے اقدام کے بعد اُس پر کچھ تاثرات ضرور نمایاں ہوئے

اس کے چہرہ پر ایک چمک سی پیدا ہوگئی جیسے ساکت فضا میں یکبارگی بجلی کوندگئی ہو اور اس کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ۔ اس نے رُکتے رُکتے کہا:

"شانتی میں بھی اپنے دل میں کب سے یہ راز چھپائے بیٹھا تھا۔ لیکن زبان کھولنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے اخلاقی جرأت سے کام نہ لیا اور آخر تمہیں لب کشائی پر مجبور ہونا پڑا۔ اُمید ہے تم مجھے معاف کردوگی۔"

جگندر آل انڈیا اکنامک کانفرنس کے لئے اکنامک تمدن کے مستقبل پر اپنا خطبۂ صدارت تیار کرنے میں منہمک تھا۔ غالباً وہ پہلا شخص تھا جسے اس کم عمری میں یہ اعزاز بخشا گیا تھا۔ وہ خود کو اس کا پوری طرح اہل ثابت کرنا چاہتا تھا اس لئے دن رات مضمون کی تیاری میں مستغرق ہو رہا تھا۔ شانتی اور اس کی شادی کو ایک سال سے زیادہ گذر چکا تھا۔ شانتی مختلف سوشل اور علمی اداروں کی ممتاز رکن کی حیثیت سے اپنا وقت گذار رہی تھی۔ لیکن ان ساری مصروفیتوں کے باوجود اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی دلچسپیوں کی حرارت رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑتی جارہی تھی۔ بسا اوقات اسے اپنی طبیعت پر جبر ڈال کر کام کرنا پڑتا۔ اُسے شک پیدا ہو رہا تھا کہ اس کی صحت میں کوئی ناقابل گرفت خرابی آگئی تھی جس کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں مدھم ہوتی جارہی تھیں۔

شانتی اکثر سوچتی کہ کچھ دنوں تفریح کی غرض سے کہیں چلی جائے لیکن جگندر کو اس کے ہمراہ جانے کی فرصت نہ تھی اور بغیر جگندر کے کہیں جانے کا وہ ارادہ نہ کرسکتی تھی۔

شانتی صبح سے افسردہ سی تھی۔ اس کی طبیعت کسی کام میں نہیں لگتی تھی، جگندر اپنے مضمون کی تیاری میں کھویا ہوا تھا۔ صبح کی چاء تک اس نے اپنی میز پر منگوا کر

پی لی۔ شانتی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر کسی فردوسی مصروفیت کی ہمہ گیر لذتوں میں گم ہو جائے۔ لیکن کوئی شغل اس کے ذہن میں نہ آتا تھا جس کی مسرت بدلانی اسے اپنی طرف کھینچ سکے۔ تفریحات کے سارے سامان سے اس کا دم الجھتا تھا وہ اُن میں سے ایک ایک پر غور کرتی تھی لیکن اس کی نگاہیں ان کی ظاہری دلآویزی کو چیر کر ان کے داخلی کھوکھلا پن تک پہنچ جاتیں۔

شام ہونے کو آئی تھی۔ جگندر اب تک اپنے آفس کے کمرہ سے باہر نہیں ہوا تھا۔ شانتی کمرہ سے نکل کر صحن میں ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر پہلے پانی برس کر ختم چکا تھا۔ فضا میں ایک فرحت بخش سنگی تھی۔ شانتی یک بیک ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں شام کے تھکے ہارے آفتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ بادلوں کی مہین ملگجی چادریں سمندر کی موجوں کی طرح آسمان کی سطح پر سمٹ سمٹ کر کھل رہی تھیں۔ آفتاب ان میں چھپ چھپ کر منہ دکھاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا جیسے دن کی ماندگی اس پر نیند کی کیفیت طاری کر رہی ہو لیکن وقت کی تنگی اور فرض کا احساس اسے رہ رہ کر چونکا دیتا ہو۔ شانتی ایسا محسوس کرنے لگی جیسے آفتاب اُسے ہم آغوشی کی دعوت دے رہا ہو۔ بادلوں کی ریشمی چادر میں منھ چھپا کر فضا کے سکوت میں گم ہو جانے کی، اس کے دل میں کشتی کی سیر کی خواہش پیدا ہوتے لگی۔ اس کے اُداس چہرہ پر تازگی سی آ گئی جیسے وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہو گئی ہو۔ وہ شوق سے قدم بڑھاتی جگندر کے کمرہ کے قریب آئی۔ لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے اس کا پیر خود بخود رُک گیا۔ جگندر اب تک قلم ہاتھ میں لئے لکھنے میں مصروف تھا! اس کے ماتھے کی شکنوں میں مسرت کی لہر سمائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ شاید وہ اپنے مضمون کا کوئی دشوار حصہ نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔ شانتی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس کے خیالات کا سلسلہ ملیامیٹ کر کے اس کا اطمینان اس سے چھین لے۔ وہ بھاری قدموں سے دروازہ سے واپس ہو گئی۔ اور اپنے کمرہ میں کرسی پر لیٹ کر اداسی کے دامن میں

بے روح سی کھوگئی جیسے کوئی زندگی کی اُلجھنوں سے اکتا کر اپنے جسم و دماغ پر موت کا سکوت طاری کر لیتا ہو۔

شادی کے بعد سے شانتی سریش سے نہ مل سکی تھی۔ سریش نے اسے اپنی شادی میں بُلایا بھی تھا۔ شانتی کسی مجبوری کی وجہ سے شریک نہ ہوسکی تھی اس کی مکافات میں اس نے چند دن سریش کے گھر قیام کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ جس کی اطلاع اس نے سریش کو خط کے ذریعہ کر دی تھی اس کو ایک سال ہونے کو آیا تھا اور وہ اب تک سریش کے گھر نہ جا سکی تھی۔ اس نے کتنی بار ارادہ کیا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔

ایک دن شانتی اپنے مشاغل سے عاجز ہو کر اکتائی سی بیٹھی تھی کہ اسے سریش کا خیال آیا۔ "وہ اب تک سریش سے اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی تھی۔" اسے ندامت سی ہونے لگی اس نے سوچا کہ چند دن سریش کی بیوی کے ساتھ تفریحات میں گذار کر وہ اپنی طبیعت بھی بہلا سکے گی۔ اس نے سریش کو اپنی روانگی کی اطلاع دے دی اور دوسرے دن اس کے گھر پہنچ گئی۔

شانتی نے سریش کے اندر کوئی تبدیلی محسوس نہ کی۔ وہ اب تک ویسا ہی زندہ دل اور ہنسوڑ تھا۔ بات بات پر چہلیں کرنا، نت نئے لطیفے گڑھ گڑھ کر اپنے ساتھ دوسروں کو ہنسانا اب تک اس کی عادت میں داخل تھا۔ متانت اور سنجیدگی اس سے اس وقت تک اتنی ہی دُور تھی۔ شانتی کی موجودگی میں وہ نرملا کو گدگدا گدگدا کر ہلکان کر دیتا۔

نرملا بھی کافی چنچل لڑکی تھی۔ دونوں آپس میں بچّوں کی طرح دھما چوکڑی مچاتے رہتے۔ آئے دن ایک دوسرے پر رنگ اُچھالتے۔ پانی کے گھڑے کے گھڑے خالی کر کے ایک دوسرے کو تر بتر کر ڈالتے۔ پہلے دن تو نرملا شانتی کے سامنے کچھ

شرمائی سی رہی۔ لیکن سریش نے چھیڑ چھیڑ کر اسے بے باک بنا دیا۔ خود اس کی طبیعت بھی چنچل تھی۔ وہ کب تک رُک سکتی۔

چاء کی میز پر سریش نے مکھن آلود چھری نرملا کے گال میں پونچھ دی۔ نرملا نے اس کے جواب میں توس کا مکھن لگا ٹکڑا سریش کے لبوں سے چپکا دیا۔ سریش نے مکھن کا ڈبہ اپنے قبضہ میں کر لیا اور کریم کی طرح نرملا کے گالوں پر مکھن ملنے کی کوشش کرنے لگا۔ نرملا دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانکے ہوئے تھی۔ سریش اس کے ہاتھ الگ ہٹانے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ اس ہاتھا پائی میں نہ سریش کو اپنی ہیئت کذائی کا ہوش تھا نہ نرملا کو اپنے کپڑوں کا۔ اس کی ساری کا پلو زمین پر لوٹ کر سریش کے پاؤں کے نیچے دب گیا۔ کھینچا تانی میں بلوز کے اوپر کے بٹن ٹوٹ کر اپنے فرض کی انجام دہی سے قاصر ہو گئے تھے۔

شانتی کرسی پر بیٹھی اس حقیقی ڈرامہ میں دل چسپی کا اظہار کر رہی تھی لیکن اندر سے اس کا دل بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا جیسے یہ منظر اس کی آنکھوں میں چبھ رہا ہو۔

ابھی نرملا اور سریش اپنی طفلانہ سرگرمیوں سے لطف اندوز ہو چکنے نہ پائے تھے کہ دفعتاً شانتی گھبرائی سی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ سریش اور نرملا یکبارگی الگ الگ ہو گئے۔ اور شانتی کے اس اچانک رویہ پر استعجاب سے اس کا مُنھ تکنے لگے۔

"کیوں شانتی؟ خیریت!" سریش نے گھبرائے لہجہ میں پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے شانتی بھاگتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی۔ اور دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر کر ڈھیر ہو گئی اس کے اعضا ہمیشہ کے لئے مفلوج ہو چکے تھے۔

(سہیل رنگیا) ۱۹۴۱ء

فرار

"محمود" ۔ ماں کی کرخت آواز محمود کے کان میں گونج گئی۔ وہ بازو کے کمرہ میں حساب بنا رہا تھا۔ حساب کی کاپی سمیٹے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نام خطرہ کی گھنٹی کی طرح اس کے کان میں بج رہا تھا۔ وہ بھاگا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اس کی ماں کا فربہ جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔ جیسے تند ہوا میں برگد کا درخت ڈول رہا ہو۔ ماں کی اُبھری ہوئی آنکھیں، لال انگارہ سا چہرہ، پھیلی ہوئی گردن دیکھ کر محمود سہم گیا گو یہ منظر اس کے لئے نیا نہ تھا۔ معصوم فرشتہ کی طرح نظریں نیچی کئے محمود ماں کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ یہ منفعلانہ انداز آنے والی آفت کے مقابلہ میں اس کا تنہا ہتھیار تھا۔

"بُلا انہیں باہر سے۔" محمود کی ماں نے گرجتے ہوئے کہا۔ "میرا مُنہ کیا

تک رہا ہے۔ جاتا ہے یا دھکّے دے کر باہر کر دوں۔ نابکار! خاندان کا اثر کہاں جائے گا۔ خبیث کی اولاد خبیث!"

محمود آہستہ سے کمرہ کے باہر نکلا اور رُکتے قدموں سے باپ کے پاس جانے لگا وہ جانتا تھا کہ اس تلاطم کے سامنے اس کے باپ کی بے ہنگامہ اور پُرسکوت شخصیت سمندر کے جوار بھاٹا کے نزدیک کاغذ کی کشتی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی، اس کا جی چاہتا تھا کہ باپ کو بُلانے کے بجائے وہ کہیں اور چلا جائے۔ مگر اس کی ہمّت قاصر تھی۔ ماں کی برانگیختگی کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ گالیوں اور کوسوں کی مسلسل بوچھار! اس کی ماں کی زندگی کا شاید ہی کوئی دن اس سے ناغہ جاتا ہو۔ وہ اس کے باپ کی سو پشت کو صلواتیں سُناتی اس کے خاندان کے وقار کو گالیوں کے نشتر سے چھلنی کر دیتی لیکن محمود کا باپ خموشی سے سب کچھ سُن لیتا۔ "آخر ابّا بھی انہیں جواب کیوں نہیں دیتے۔ وہ بھی تو انہیں ایسا ہی بُرا بھلا کہہ سکتے ہیں وہ چپ کیوں رہ جاتے ہیں۔" محمودؔ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ "ماں کو خرچ کے لئے روپے تو وہی لا کر دیا کرتے ہیں۔ کس محنت سے کام کر کے وہ روپے کماتے ہیں، اماں بیٹھی بیٹھی سب خرچ کر دیا کرتی ہیں اور اُلٹا انہیں صلواتیں سناتی ہیں۔ وہ اگر باپ کی طرح روپیہ کماتا ہوتا تو ماں کی سختیاں ہرگز برداشت نہ کرتا۔" محمود جب کبھی ماں کا مزاج موافق پاتا تو کہتا۔" اماں تم ابّا سے اتنا غصّہ غضب کرتی ہو۔ اگر ابّا بھی غصّہ ہو جائیں تو پھر تمہیں روپیہ کما کر کون دے گا۔"

"ان کی مجال ہے۔" اس کی ماں ہنس کر ٹال دیتی۔

آخر ان کی مجال کیوں نہیں ہے؟۔ وہ اماں سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔؟ ماں کا غضب آلود چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ کر اس کے سوال کا جواب بن جاتا۔

"اماں آج پھر بڑے غصّہ میں ہیں۔ آپ کو بلا رہی ہیں۔" محمود نے رُکتے

رکتے کہا۔

" مجھ سے کیا کام ہے؟ غصّہ میں ہیں تو ہوا کریں، انہیں تو ہر وقت غصّہ ہی چڑھا رہتا ہے۔ میں نہیں آتا۔ جاؤ کہہ دو۔ مجھے اس وقت کام ہے۔ ان کا تو سر پھرا ہوا ہے۔ خواہ مخواہ بات بات پر غصّہ غضب! پاگلوں کی طرح گھر کو سر پر اُٹھائے رہتی ہیں۔"

محمود کے سہمے ہوئے چہرہ پر شگفتگی آ گئی۔ جیسے اس کا باپ اس کے دل کی کہہ رہا ہو۔ وہ باپ کے اندازِ گفتگو میں اپنی جیت محسوس کر رہا تھا۔

" اچھّا چلو آتا ہوں۔" اُس کے باپ نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔ محمود کے چہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پہلے سے زیادہ جیسے اُسے اپنی غلط فہمی کا ناخوشگوار احساس ہوا ہو۔

محمود کے باپ کو دیکھ کر اس کی ماں اور بلند آواز میں گرجنے لگی۔

" تم نے میری مٹّی پلید کر ڈالی۔ نوج اس دن کو جب میرے باپ نے تمہارے ساتھ میری شادی کی۔ ان کی عقل پر پتھّر پڑ گئے تھے۔ آنکھوں پر پٹّر ڈال کر مجھے ایسے ذلیل خاندان میں انھوں نے دھنسا دیا۔"

" آخر کچھ کہو گی بھی یا یونہی بکے جاؤ گی؟" محمود کے باپ نے آہستگی سے سوال کیا۔

" ہاں ہاں! میں تو بکواس کرتی ہی ہوں۔ پاگل سڑی سب کچھ ہوں، پاگل نہ ہوتی تو پاگلوں کے گھر کیوں آتی؟ مجھے پاگل کہتے تمہیں شرم تو نہیں آتی۔ آخر میں پاگل ہوئی کیسے۔ تم پاگلوں کے ساتھ رہ کر نا۔"

" ارے بھائی میں کب کو تمہیں پاگل کہہ رہا ہوں۔ اپنے منہ جو چاہو کہہ لو۔"

" ہاں جی تم سا شریف دنیا میں کون ہوگا۔ جانے دو میں رذیل سہی کمینی سہی۔ لیکن تمہارے گھر میں اب ایک منٹ میرا قدم نہیں جم سکتا۔ میں اب یہاں سے

جاتی ہوں اور مرنے پر بھی تمہارا منہ دیکھنے اس گھر میں نہ آؤں گی۔"

"ارے بھئی خدا کا واسطہ کچھ بتاؤ بھی تو۔"

"اہا۔ کیسے بھولے ہیں آپ۔ گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ بیٹھے بیٹھے سارا فساد مچاتے رہتے ہیں اور اوپر سے دیکھو تو جیسے موم کی گڑیا۔ میں نے تمہیں ہزار بار منع کیا ہے کہ اس موئے وکیل کے یہاں نہ جایا کرو۔ لیکن تم کہاں ماننے والے۔ اس کی جورو تو ڈائن بن کر مجھے نگلنے کی فکر میں رہے۔ اور تم اس کے میاں سے گھل مل کر میٹھی میٹھی باتیں کیا کرو۔ 'بھابھی صاحبہ!' شرم نہیں آتی بھابھی کہتے اتنی بھاگئی ہے تو اسے ہی گھر میں لاکر کیوں نہیں بٹھا لیتے۔ مجھ کو بھی نجات مل جائے گی۔ مُردار کو سانپ بھی نہیں سونگھ جاتا۔ چڑیل۔ میرا بس چلے تو جلتے کڑاہ میں اُسے زندہ ڈال دوں۔"

"ارے بھئی، آہستہ بولو۔ محلّہ والے سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ تمہیں تو خواہ مخواہ شک پیدا ہو جاتا ہے۔"

محمود کی ماں نے اور چیخ چیخ کر بولنا شروع کیا۔ ہزاروں گالیاں وکیل کو دیں۔ سیکڑوں صلواتیں محمود کے باپ کو سنائیں اور جب بک کر تھک گئی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ محمود کے باپ نے سو سو طرح سے خوشامدیں کیں، منّتیں مانیں۔ ہاتھ جوڑے، عہد و پیمان کئے تب جاکر کہیں اس کا غصّہ ٹھنڈا ہوا۔

محمود اپنی عمر کے دسویں ہی سال میں یتیم ہو گیا اور باپ کے مرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کی ماں بھی اُسے چھوڑ گئی۔ قسمت نے اُسے اس کے عسرت زدہ ماموں کے مکان میں منتقل کر دیا۔ زندگی کی دشواریاں اس کے لئے ایک نامہرلیکن عاقبت اندیش استاد بن گئیں۔ ماحول کی ناسازگاریاں اسے جتنی زیادہ ٹھوکریں لگاتیں اس کے اندر استواری اور استقامت کی کوششیں اتنا ہی زیادہ تیز ہوتی جاتیں۔

اس صغرسنی میں بھی وہ مستقل مزاجی اور پختگی عزم کا ایک مکمل نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کا بچپن، طفولیت اور شباب کے درمیانی مراحل پھاندکر، انسانی تعمیر کی آخری منزل تک پہونچ گیا ہو۔ اس کی وضع قطع، چال ڈھال میں کبرسنی کی پختگی اور سنجیدگی نمایاں تھی۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ اُسے دنیا کی کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ ابتدا سے برابر اپنے کلاس میں اوّل ہوتا آیا تھا۔ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں بھی اول ہوتا ہوا وہ اب لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے دوسرے درجہ کا طالب علم تھا۔ اُسے یونیورسٹی سے معقول وظیفہ مل رہا تھا۔ اور وہ اپنی تعلیم کے اخراجات کا خود کفیل ہوگیا تھا۔

محمود یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں اُس کی تنہائی پسندی اور رہبانیت کا اس کے ساتھی برابر مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی فضا کو ایڈوکیشن' (لڑکے لڑکیوں کی یکجا تعلیم) کی وجہ سے گہری رومانی ہوگئی تھی۔ گو لڑکے لڑکیوں کے باہمی اختلاط میں اوپر اوپر سے کافی رکاوٹیں پیدا کردی گئی تھیں۔ کلاس میں رلیکچر دینے کے علاوہ، اساتذہ کے ذمہ شاگردگاں کی "پاسبانی" بھی سپرد تھی۔ لکچر دیتے وقت انھیں لڑکوں کی دزدیدہ نگاہیں اور فضا میں ان کی گہری سانسوں کا ارتعاش بھی محسوس کرنا ہوتا تھا۔ خیالات کے ربط و تسلسل سے زیادہ انھیں اپنے اس ذمہ دارفرض کی طرف توجہ رکھنی پڑتی۔ اک ذرا ان سے چوک ہوئی نہیں کہ سمٹے ہوئے کاغذ کی ننھی ننھی گولیاں تمناؤں کا جادو چھپائے لڑکیوں کی ڈسک پر سرکنے لگتیں۔ ان میں زیادہ تر اپنے راز سمیٹے ہی رہ جاتیں۔ لیکن بعض کے سینے ریشمی آنچلوں کی امان میں چاک کئے جاتے اور مدعائے تحریر دوشیزہ نگاہوں میں پیوست ہوکر زیرلب مسکراہٹ کی مہر قبولیت سے سرفراز کیا جاتا۔ اس طرح پیامبروں کے پیام منزل مقصود تک پہونچ جاتے۔ ملاقات کا وقت، مقام متعین ہوجاتا اور کالج کے اوقات کے بعد سینما، نمائش گاہ ریسٹوران کی فضائیں، ساری کی زنگارنگی اور سنٹ و پوڈر کی شمیم سے

مہکنے لگتیں ۔ محمود کے ساتھی کمال جادو بیانی اور گرم جوشی کے ساتھ ان فردوسی مناظر کی تصویریں اس کے آگے کھینچتے ۔ محمود کی طبیعت میں بھی گدگدی سی پیدا ہوجاتی ۔

" یار تمہارے سینہ میں دل نہیں لکڑی کا ٹکڑا ہے جس پر بجلی تک کا اثر نہیں ہوتا ۔ کل کلاس میں خالدہ کس طرح نظریں بچا بچا کر تمہیں تک رہی تھی ۔ کاش وہ اس طرح مجھے دیکھتی ہوتی ۔ یقین مانو میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہوتا ۔" عظیم نے اپنے خاص پُرجوش انداز میں کہا ۔

" کیا بے پر کی اُڑا رہے ہو ۔" محمود نے جواب دیا ۔

" کم بخت ! تیرے فائدہ کی کہہ رہا ہوں ۔ اس ساری پڑھائی لکھائی کا مقصد آخر ہے کیا ؟ آپ جو ہر امتحان میں اول ہوتے چلے جارہے ہیں آخر کس واسطے ؟ یہی نا کہ بڑی سے بڑی سروس مل جائے اور اچھی سے اچھی عورت ۔"

" ہوگا ایسا ہی تمہاری کوتاہ بین نگاہوں میں ۔" محمود نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" اہا ! نہیں صاحب بھول ہوگئی ۔ آپ جیسا بالغ نظر تو اپنے زمانہ کا آئینسٹائن وغیرہ بن کر رہے گا ۔ آپ کو عورت ووَرت سے کیا مطلب ۔"

" تو آئینسٹائن کی کیا بیوی نہیں ؟"

" غلط کہا میں نے آپ بے جورو کے آئینسٹائن ہوں گے ۔" عظیم نے یہ کہہ کر ایک لمبا قہقہہ لگایا ۔

محمود بھی مُسکرادیا ۔

" خیر مذاق وغیرہ ختم کرو ۔ بے چاری معصوم لڑکی پر جو تم اس قسم کی تہمت لگاتے ہو یہ تو بہت نامناسب ہے ۔"

" تہمت کیسی ؟ ہم انہیں گھورتے رہتے ہیں اور وہ بے چاریاں ہمیں تکنے سے بھی رہیں ! اور بھئی تمہیں تو اپنا مول معلوم نہیں ۔ کاش میرے اندر تمہاری

شکل و صورت ہوتی۔ میری زندگی ایک مستقل رومان ہوتی رومان۔" عظیم نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرہ میں شوق کی لہروں نے بالیدگی پیدا کر دی، اور اس کی آنکھیں کشادہ ہوگئیں جیسے وہ کسی رومانی منظر کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

" تو آپ کیا کرتے ؟ " محمود نے سوال کیا۔

" میں اس سے تنہائی میں ملتا، اپنی جوانی اس کے قدموں پر نثار کرتا۔ زندگی ہم دونوں کے لئے ایک رنگین خواب بن جاتی۔ ایک فردوسی سرگذشت، ایک ملکوتی ...... " جذبات سے بے قابو ہو کر عظیم رُک گیا۔

" اور پکڑے جاتے تو پھر رسٹیکیشن کی نوبت آتی۔ خواب کی تعبیر ذلّت و رسوائی کی صورت میں آپ کے پیچھے لگ جاتی۔ کیوں ؟ "

" ارے کون کس کو پکڑتا ہے۔ یونیورسٹی نے لڑکیوں پر چھاپہ مہر ڈال رکھا ہے تو جیسے کوئی انہیں ہاتھ ہی تو نہیں لگاتا۔ آج شام کو نمائش آؤ تو تمہیں دکھلا دوں کہ یاران نکتہ داں کے لئے کیسی صلائے عام ہے۔ "

" نہیں بھائی میں نمائش وغیرہ میں جا کر تم لوگوں کی طرح لوفری کرنے سے رہا۔ " محمود نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

" اچھّا بڑے ذات شریف ہیں آپ۔ تب ہی تو عورتوں کے خوف سے کوٹھریوں میں دبکے رہتے ہیں۔ کہیں باہر کی ہوائیں ہوس کی چنگاری کو بھڑکا نہ دیں۔ سارے جہان کا پاپ دل میں سمیٹے بیٹھے ہو۔ تب ہی تو عورتوں سے نظر ملانے کی ہمّت نہیں پڑتی۔ اک ذرا آنچ لگی اور شیشہ پگھلنے لگا۔" عظیم نے طنز سے کہا۔ محمود کے چہرہ کا رنگ تیز ہوگیا۔ جیسے اس نے عظیم کی گفتگو کا نشتر محسوس کر لیا ہو۔

" عظیم اگر میرے متعلق تمہارا ایسا خیال ہے تو میں ضرور چلوں گا۔ مجھے اپنے اوپر اس درجہ اعتماد ہے کہ سومہ جبینوں کے درمیان بھی کھڑا کر دو تو پاؤں میں لغزش نہ پاؤ گے۔ "

"یار لمبی لمبی باتیں کرنی تو مجھ کو بھی آتی ہیں۔" عظیم نے تحقیرانہ انداز میں کہا۔

"نہیں صرف باتیں نہیں بناتا۔ میں تمہارے کہنے پر آج شام کو نمائش جاؤں گا، پھر وہاں سے کسی رسٹوران میں چلنا۔ لینے آنا اپنی کسی مہ پارہ کو وہ بھی میری استقامت آزمائے گی۔"

"واقعی چلوگے یا صرف آن میں بول رہے ہو؟" عظیم نے محمود کے چہرہ پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

"محمود کسی دعوے کے بعد قدم پیچھے ہٹانا جانتا ہی نہیں!" محمود نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

"اچھا تو آج اسے بھی دیکھ لیا جائے۔" عظیم نے مسکراتے ہوئے کہا اور محمود کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

عظیم تو محمود سے وعدہ لے کر چلا گیا۔ لیکن محمود ایک عجیب تاثراتی کشاکش میں مبتلا ہو گیا۔ جیسے کوئی کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر کے پچھتانے لگا ہو اور نتائج کے موہوم لیکن ہوش ربا تصورات کیفیات کے سانچے میں ڈھل کر اس کی روح میں پیوست ہو رہے ہوں۔ محمود کی انگلیاں غیر اضطراری طور پر رہ رہ کر اس کی نبض ٹٹولنے لگتیں جیسے اسے بخار کا احساس ہو رہا ہو۔ اس کے دل میں ایک غیر معمولی وحشت ناک ویرانگی کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی رات کے سناٹے میں کھلے میدان سے خوف کھانے لگتا ہو۔ اس غیر معمولی اضمحلال اور خستگی کا کوئی سبب محمود کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اسے گمان ہو رہا تھا کہ شاید اس پر کسی بیماری کا حملہ ہونے والا ہے اور اس کی یہ کیفیت اسی کا پیش خیمہ ہے۔ "ایسی حالت میں مجھے نمائش نہ جانا چاہئے۔" اس نے سوچا۔ لیکن وہ اپنے وقار کو اس طرح چکنا چور ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ "عظیم کیا سمجھے گا؟ اور ساتھیوں کے نزدیک کتنی بڑی سُبکی ہوگی۔ مجھے جانا ہی چاہئے۔" محمود نے فیصلہ کر لیا اور جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ کپڑے پہننے میں اسے غیر معمولی

دیر ہو رہی تھی قمیص اس نے اُلٹی پہن کر دوبارہ درست کی۔ جوتے دونوں پاؤں میں دو مختلف جوڑوں کے پہن لئے، اور دروازہ سے باہر نکلا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظروں کو اس غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کمرہ کے اندر لوٹ گیا۔ پھر اسے اس فیصلہ پر پہونچنے میں کافی دیر لگی کہ وہ کس جوڑے کا انتخاب کرے، کس پاؤں کا جوتا رہنے دے اور کس پاؤں کا اُتار کر بدل لے۔ جوتے پہن کر وہ ہوسٹل سے باہر نکلا اور قدم تیز کرتا ہوا نمائش کو روانہ ہوا۔ کافی دور پہونچ چکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلط راستہ پر لگ گیا ہے۔ اسے اپنی اس بھول پر حیرت سی ہو رہی تھی۔ "میں کبھی بھی اس طرح رستہ میں بھٹکا نہ تھا۔" اسے اپنی حس سمت پر کافی غرور تھا۔ صحیح رستہ پر پہنچنے کے لئے اس نے واپسی کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ اپنی اس فروگذاشت پر سخت خجل اور پشیمان ہو رہا تھا۔ جیسے اس سے کوئی ناقابل تلافی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ "کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں وقت معینہ سے بہت دیر بعد پہونچوں گا۔" اس نے خیال کیا۔ اسے اپنے پابند وقت ہونے پر بھی فخر تھا۔ "آخر یہ غلطی ہوئی ہی کیوں؟ وہ رستہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ نمائش کے اندر نہ گیا ہو لیکن نمائش گاہ تک تو اکثر ٹہلا کیا تھا۔" اس کی عقل اس کے سامنے مختلف توجیہات پیش کر رہی تھی لیکن ہر ایک اسے ناقابل قبول نظر آتی۔ وہ اسی طرح خیالات کی رو میں کھویا ہوا چل رہا تھا کہ یکایک ہوسٹل کے احاطہ کے قریب پہونچ کر ٹھٹک گیا۔ نمائش کی طرف مڑنے کے بجائے سیدھا ہوسٹل واپس آ گیا تھا۔ اس غیر سبب غلطی کا دوبارہ احساس اس کے لئے روح فرسا تھا۔ اس کے پاؤں سرد ہو گئے اور وہ دیر تک اسی جگہ مبہوت کھڑا رہا جیسے اُسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ "اب نمائش جانا بالکل بے سود ہے۔" اس نے کہا۔ "عظیم انتظار کر کے کہیں اور جا چکا ہو گا۔" وہ اپنے کمرہ کی طرف لوٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی اس خود فراموشی کا جائزہ لینے لگا۔ "آخر اسے ہو کیا گیا تھا؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

اپنی خود اعتمادی پر یہ کاری ضرب کئی دنوں تک محمود کے دماغ میں اُلجھنیں پیدا کرتی رہی گو عظیم سے اس نے طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کر دیا تھا جسے عظیم نے "بہانہ سازی" کہہ کر ٹال بھی دیا۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد محمود مقابلہ کے امتحان میں شامل ہوا اور اسے ڈپٹی کلکٹری مل گئی۔ نسبتیں اس کی تعلیم کے وقت ہی سے آتی تھیں۔ اب بڑے بڑے گھرانوں سے پیام آنے لگے۔ محمود ہر ایک منسوب پر کافی غور و فکر کرتا۔ اُسے ہر پہلو سے جانچنے کی کوشش کرتا اور آخر کار اپنے معیار کے مطابق نہ پاکر مسترد کر دیتا۔ کہیں گھرانا اچھا ہوتا تو لڑکی تعلیم یافتہ نہ ہوتی۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہوتی تو خاندان میں کوئی نہ کوئی کسر پائی جاتی، لڑکی کے باپ رشتہ کئے جانے کے قابل نہ ٹھہرتے، یا لڑکی کے حقیقی چچا کسی اخلاقی کمزوری کے شکار پائے جاتے۔ اس طرح کافی مدت گذر گئی اور محمود کسی نسبت کا انتخاب نہ کر سکا۔ رفتہ رفتہ نسبتوں میں کمی ہونے لگی۔ لوگوں کو خیال ہونے لگا کہ ڈپٹی صاحب شادی کے معاملہ میں ڈھیلے ہیں۔ بعض لوگوں نے مشہور کر دیا کہ ان کی شادی بچپن میں ہو چکی تھی لیکن بیوی سے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ "شادی کے قابل ہی نہیں"۔ غرض مختلف خیال آرائیوں کے بعد یہ امر مسلم الثبوت تک پہونچا دیا گیا کہ ڈپٹی صاحب دراصل شادی کرنا چاہتے نہیں۔ لیکن حقیقت میں محمود شادی کا غایت درجہ خواہش مند تھا۔ اُسے بھی آرزو تھی کہ دوسرے احباب کی طرح وہ بھی متاہل زندگی کا لطف اُٹھائے۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کی دفتر سے واپسی کا منتظر رہا کرے اور جب وہ تھکا ہارا گھر واپس آئے تو کسی کی مضطرب نگاہیں اس کے چہرہ کی باریک شکنوں میں اس کے دل کی کیفیتیں ڈھونڈھنے لگیں۔ جب اعلیٰ افسر کی چیرہ دستیاں اس کے قلب و دماغ میں ہیجان برپا کر دیتی ہوں تو کسی پیشانی کے

نشیب و فراز میں وہ اپنی پریشانیوں کا عکس دیکھ سکے اور کسی کے پرشوق کان اس کی مظلومی کی حکایت سن کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا کردیں۔ وہ روز کتنے ایسے رومانی خواب بُنا کرتا تھا۔ اُسے صرف ایک رفیقۂ حیات ہی کی آرزو نہ تھی بلکہ وہ اپنے گھر میں ایک ننھی بھولی بھالی بچّی کا تصور بھی کیا کرتا تھا" جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور اس کی ماہرانہ پرداخت کے ذریعہ طبقۂ نسواں میں ایک درخشاں ستارہ بن کر رہے گی۔" لیکن محمود کی آرزوئیں پوری نہ ہوسکی تھیں۔ اسے اب نسبتوں کی کمی کا احساس بھی ستانے لگا تھا۔ اُسے ڈر ہونے لگا تھا کہ کہیں اس کے خواب خواب ہی ہوکر نہ رہ جائیں۔

ایک دن محمود گھر سے واپس آیا تو گھر کی ویرانی اُسے کاٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اُسے اپنی زندگی حیات کی ایک بے روح نقل نظر آنے لگی۔ گھر کے سنّاٹے میں دیوار سے لگی ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی اس کے دماغ پر ٹھوکریں سی مارنے لگی، گھڑی کا پنڈولم اُسے اپنی ذات کا مرقع معلوم ہونے لگا۔ ویسا ہی ایک طریقہ اور ایک رنگ پر حرکت کرتا ہوا۔" وہ کب تک مشین کے پُرزوں کی طرح زندگی گذارتا رہے گا؟" اس نے سوچا اور فیصلہ کرلیا کہ وہ بہت جلد شادی کرکے زندگی کی کیف مآبیوں سے ہم کنار ہوکر رہے گا۔ اسی شام کو اس نے اپنی ساری پچھلی نسبتوں پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کردیا۔ اکثر و بیشتر کے متعلق اسے علم تھا کہ وہاں اب اس کے لئے جگہ خالی نہ رہی تھی۔ باقی ماندہ چند نسبتوں میں اُسے ایک ہر اعتبار سے قابلِ اعتنا معلوم ہوئی۔ صرف لڑکی کی تعلیم نامکمل تھی، لیکن لڑکی کا سن زیادہ نہ تھا اس لئے یہ خامی دور کی جاسکتی تھی۔ محمود نے اس نسبت کی از سرِ نو چھیڑ چھاڑ کرائی۔ بات پختہ ہوگئی اور عقد بھی جلدی ہوگیا۔ لیکن رخصتی لڑکی کے میٹریکولیشن پاس کرنے تک ملتوی رکھی گئی۔

عقد کے بعد محمود نے دو سال اپنی مستقبل ازدواجی زندگی کے سُنہرے خواب

دیکھتے ہوئے کاٹ دیئے یہاں تک کہ زبیدہ میٹریکولیشن کے امتحان سے فارغ ہوگئی۔ لڑکی والوں نے امتحان کے بعد ہی رخصتی کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن محمود نے ایک ماہ اور صبر کرکے کامیابی کی خوشی سے شادی کی مسرّت کو دوبالا کرنے فیصلہ کرلیا اور شادی کی تاریخ امتحان کے نتیجہ کے بعد رکھی۔

امتحان کا نتیجہ زبیدہ کی خاطر خواہ کامیابی کا مژدہ لایا۔ محمود خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ اُس کے خواب اب حقیقت بننے والے تھے وہ اس خیال کی لذّت سے سرشار ہورہا تھا۔ امتحان کی کامیابی پر مبارک باد کا خاص تار اُس نے اپنی سسرال روانہ کیا لیکن تار بجائے مبارک باد کے تعزیت کا نکل آیا۔ محمود نے ٹیلی گرام گائڈ سے تار کا نمبر نقل کرنے میں غلطی کی تھی۔ اور بجائے "مبارک باد" کے "تعزیت" کا نمبر تار کے فارم پر لکھ دیا تھا۔ محمود کی سسرال والوں نے اس فرد گذاشت کو فوراً سمجھ لیا۔ اور انہیں کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہوئی۔ محمود کو خود اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

دوسرے ہی دن سے محمود اپنی شادی کی تیّاری میں منہمک ہوگیا۔ اس نے دفتر سے ڈھائی ماہ کی مسلسل فرصت لے لی۔ شادی کے اخراجات پر اس نے کثیر رقم خرچ کی۔ شہر کے سارے معززین کو بارات کی شرکت کی دعوت دی۔

پورے سازوسامان کی ہیت میں بارات لڑکی کے گھر پہونچی۔ محمود زرق برق لباس میں مزیّن کسی بڑی راج دھانی کا ولی عہد معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لمبا قد، اس کے متناسب اعضا، اس کا سُرخ سپید رنگ، ہزاروں بنے سنورے باراتیوں کے درمیان، ستاروں کی جھرمٹ میں چاند کی طرح دل کش معلوم ہورہا تھا۔ شوق ومسرّت کی رنگینی اس کے چہرہ سے نمایاں تھی۔ لیکن سسرال میں قدم رکھنے کے بعد سے اس کے اندر ایک عجیب حیرت انگیز تغیر پیدا ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور اور متوحش سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کا جسم برف کی طرح سرد

ہوتا جا رہا تھا اور چہرہ کی سُرخی رفتہ رفتہ پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی دور سے ایک بھیانک منظر دیکھ رہا ہو۔

باہر کے لوازمات کے بعد جب محمود کو زنانہ مکان کے اندر لے جایا جانے لگا تو اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی اور اس کے سارے جسم میں ایک ہیبت ناک تھرتھراہٹ، جیسے اسے شدّت کا جاڑا لگ رہا ہو۔ آگے قدم بڑھانا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ عورتوں میں محمود کی اس کیفیت پر ہلچل سی مچ گئی۔ اُس کے سسر کو اطلاع دی گئی وہ بھاگا ہوا محمود کے قریب آیا۔ مزاج پُرسی کی، طبیعت کا حال دریافت کیا۔ لیکن محمود کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ جیسے وہ دفعتاً گونگا ہو گیا ہو، یا اس نے ابھی بولنا سیکھا ہی نہ ہو۔!

(معاصر، پٹنہ) ۱۹۷۱ء

نئی ماما

"اچھّا! یہ نئی عورت کون ہے؟" ذاکر نے ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھتے ہی بیوی سے سوال کیا۔ "کیا کوئی نئی ماما رکھی گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ جوان ہے، بیوہ، صورت شکل بھی خاصی ہے۔ کیوں پسند آگئی کیا؟" زبیدہ نے مسکراتے ہوئے ذاکر کی چٹکی لی۔

"ہوگی۔ مجھے اس کی صورت تھوڑی دکھائی دے رہی ہے۔"

"نزدیک بلادوں۔ آپ کو ضرور پسند آجائے گی۔"

"تو پھر تم ایک منٹ اسے ٹکنے بھی دو گی۔؟"

"کیوں نہیں۔" زبیدہ نے قطعاً بے اثری سے کہا جیسے وہ بے سمجھے بول رہی ہو

"خیر!" ذاکر نے ماما کی طرف نظر جماتے ہوئے کہا لیکن وہ اس کی پیٹھ کے علاوہ

کچھ نہ دیکھ سکا اور سیٹی بجاتا ہوا بالائی منزل پر چلا گیا۔

"جوان ماما گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔" اس نے سوچا "لیکن نقصان کیا ہے؟ بے چاری بیوہ ہو کر بے سہارا ہو گئی ہو گی۔ گھر میں ہے ہی کون جس سے کوئی خطرہ ہو، مجھ کو اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں۔ ان لغویات کی فرصت ہی کہاں۔ بے فکری اور شباب کا جب زمانہ تھا کافی لطف رہا۔"

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو

ایں رندی و سرمستی در عہد شباب اولیٰ

ذاکر خواجہ حافظ کا شعر گنگنانے لگا۔ ماضی کی لذتوں کے مختلف نقوش پے بہ پے اس کے تصور پر ابھرنے لگے جیسے کوئی رنگین تصاویر کے البم کی ورق گردانی کر رہا ہو۔ ایک خاکہ پر اس کے خیالات کی رفتار تھم گئی۔ "سکینہ کتنی خوب صورت تھی۔" سکینہ کے ساتھ اس کی وابستگی، سکینہ کا اس سے انتہا پیار، سکینہ کا روح فرسا انجام، یہ ساری باتیں بجلی کی رفتار کے ساتھ اس کے دماغ سے گزر گئیں۔ "نہیں جوان ماما رکھنا ہرگز ٹھیک نہیں۔ مفت کی بدنامی، میری لغزشوں کا زمانہ تو اب ختم ہو چکا۔ پھر بھی لوگوں کو فضول شبہ ہو جا سکتا ہے۔ گناہ بے لذت۔ جانے واقعی اس کی صورت کیسی ہے۔ ہو گی نہایت مکروہ۔ تب ہی تو وہ اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ کسی حسین لڑکی کو گھر میں رہنے دیں گی؟ ان عورتوں کو کبھی شوہروں پر اعتبار ہو سکتا ہے؟ ان کی فطرت میں بدگمانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ شک کرتی ہیں۔ کم بختوں کو عقل کہاں مرد اسی بدظنی سے اکتا کر ان کی طرف سے نظر پھیر لیتا ہے۔ مجھے ان سے کتنی محبت ہے جب سے شادی ہوئی میں نے کبھی اُن کے سوا کسی کو دل میں جگہ نہ دی۔" ذاکر کا ضمیر مس نائگ کے ساتھ اس کی دوستی کی یاد دہانی کرنے لگا۔ "لیکن میں نے ان کے ساتھ التفات میں کوئی کمی نہ کی۔ انہیں کوئی فرق محسوس ہونے نہ دیا۔ ان کا یہ عالم ہے کہ بات بات پر شک۔ ایسی ہی کرتوتوں سے آدمی چڑھ کر وہ سب کچھ کرنے لگتا ہے۔" ——

اس کے چہرہ پر متانت پیدا ہو گئی۔ جیسے وہ کوئی اہم ارادہ کرنے والا ہو۔ "جوانی میں بیوہ ہو جانا بڑا برا ہے۔" وہ سوچنے لگا۔" اس بیچاری کے دل میں ابھی سارے ارمان بھرے ہوں گے۔ سوسائٹی کا بڑا ظلم ہے۔ دل کی تمنائیں کسی سے بیان کرے تو لوگ سنگسار کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کی بے بسی پر کسی کی نظر نہ جائے گی۔ سوسائٹی کی اس حماقت کو دور ہونا چاہئے۔ آخر اس کے معنی کیا ہوئے۔ ایک شخص کی زندگی برباد ہو جائے۔ اس کے سارے ارمان خاک میں مل جائیں اور سوسائٹی اس کا مداوا کرنے کے عوض اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کو آمادہ رہے۔ ایسا نہ ہونے دینا چاہئے۔ پڑھے لکھے سمجھدار لوگ کیوں سوسائٹی کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ تو سب کچھ دیکھ سکتے ہیں سب کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم و کلچر کا صحیح مفہوم تو یہی ہے کہ آدمی روایتی توہمات سے آزاد ہو کر صحیح و مناسب طریقہ پر عمل کرے۔ بیچاری جوان بیوہ! اگر کسی کے ساتھ ہنس بول کر دل بہلا لیا کرے تو اس کے دکھ کا کچھ تو علاج ہو گا۔ اور اس میں کسی کا نقصان بھی نہیں" ذاکر کے چہرہ پر بشاشت آگئی۔ لیکن فوراً ہی اس کی جگہ مآل اندیشی کی بے رونقی نے لے لی "نہیں ہرگز اس جوان بیوہ کو نہ دکھنا چاہئے۔" ذاکر سوچنے لگا۔" خصوصاً اگر وہ خوبصورت بھی ہے۔ جوانی ہی تو اصل حسن ہے تندرست جوانی۔" مس نائک کے بھرے ہوئے اعضا کا تصور تھوڑی دیر کے لئے تخیل کی رو کے سامنے آکر رک گیا۔" ان میں اسی کی تو کمی ہے قبل از وقت بوڑھی دکھائی دینے لگی ہیں۔" زبیدہ کا نحیف لاغر چہرہ اس وقت اسے اور زیادہ خستہ اور بے رونق معلوم ہونے لگا۔" مجھے ان سے محبت ہے بوڑھی معلوم ہوں تو کیا حقیقت میں ان کا سن تو زیادہ نہیں۔" وہ سوچنے لگا کہ شوہر بیوی کے لئے کافی قربانیاں کرتا ہے۔" وہ اگر میری بیوی نہ ہوتیں تو شاید میں آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھتا۔ کوئی خاص بات تو ان کے اندر ہے نہیں"۔ اس کا دماغ ایک غیر جانبدار نقاد کی طرح زبیدہ کی صورت کا جائزہ لینے لگا۔" پھر بھی میں ان سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ انہیں معمولی معمولی بات میں مجھ پر شک ہو جاتا ہے۔" بیوی کی یہ حرکت

اُسے نہایت ناپسندیدہ معلوم ہوئی "حد درجہ کی خود غرضی" اسے ایک تکلیف دہ احساس پیدا ہوا"۔ ماما جوان ہرگز نہ ہوگی۔ خوب صورت ہونا تو ناممکن ہے"۔ اس کے دل میں ماما کو دیکھنے کی تیز خواہش پیدا ہونے لگی، اور وہ زینہ سے اُتر کر نیچے چلا آیا۔

"کیوں! کوئی کام ہے کیا؟" زبیدہ نے تعجب سے سوال کیا۔ "میں تو سمجھی کہ آپ اوپر کسی کام میں لگ گئے ہیں۔"

"نہیں! اچھا یہی آپ کی نئی ماما ہیں!" ذاکر کی نظر ماما کے خوبصورت چہرہ پر پڑی جو دُور بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔

"ہے نہ جوان؟"

"ہوگی۔ لیکن تم بھی غضب کرتی ہو۔ اگر ایسی شکل حسین کہی جائے تو جانے بدصورت کسے کہا جائے گا۔" ذاکر نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔

"واہ بےچاری کیسی بھولی بھالی ہے۔" زبیدہ کے سوکھے ہوئے گالوں پر طمانیت کی سُرخ ڈوریاں نمودار ہوگئیں، جس سے اس کا مریض چہرہ اور بدصورت ہوگیا۔ ذاکر کی نظریں زبیدہ کے چہرہ سے ہٹ کر دوبارہ ماما کی طرف پھر گئیں اور وہ حریص نگاہوں سے اسے تکنے لگا۔

"لیکن اس کے رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کام تو ایک ماما سے چل ہی رہا تھا"۔ ذاکر نے زبیدہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"بس آپ کو خرچ کا خیال ہوگیا۔ کام تو بغیر ایک ماما کے بھی چل سکتا تھا۔ لیکن میری صحت بھی تو اس قابل ہوتی۔"

"ارے توبہ! میں نے یونہی کہہ دیا۔ مجھے کیا تمہاری صحت کا خیال نہیں۔ کونسا فاضل خرچ ہی ہو جائے گا۔ اور پھر میں جو کچھ کماتا ہوں تمہاری ہی خاطر یا اپنے لئے۔ تم تو ذرا ذرا سی بات کی پکڑ کرلیتی ہو۔" زبیدہ کے چہرہ پر خجالت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

نئی ماما کا خوب صورت چہرہ، اس کا سڈول تندرست جسم، ذاکر کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ بار بار اس کی طرف سے ذہن منتقل کرنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا اسے زبیدہ سے غایت محبت ہوگئی تھی۔ زبیدہ کی کوئی تکلیف وہ برداشت نہ کر سکتا تھا دس سال کی پرسکون رفاقت نے اسے زبیدہ کے ساتھ ایک گہرا انس پیدا کر دیا تھا۔ اس کی دل جوئی، اس کی جمعیت خاطر کا سامان وہ اب عادتاً کرنے لگا تھا۔ نئی ماما کے ورود نے اس کی پرسکون اور عافیت مآب زندگی میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ اس کا دماغ خوف اور خطرہ کی کیفیت محسوس کرنے لگا جیسے دور اٹھتا ہوا بگولا صحرانشیں کے دل میں دہشت طاری کر دیتا ہو۔ "ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔" وہ سوچنے لگا۔ "وہ اس کی تاب نہ لا سکیں گی۔" اسے زبیدہ سے ہمدردی ہونے لگی۔ "نہیں ان کے ہوتے ہوئے میں کسی دوسرے پر نظر کیوں ڈالنے لگا۔" نئی ماما کا تندرست اور خوبصورت ڈھانچہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ "ان کا اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ ان کے ساتھ جو مجھے دلی تعلق ہے اس میں فرق تھوڑا ہی آجائے گا۔؟ میری محبت میں کوئی کمی تو آنے کی نہیں لیکن وہ ہرگز راضی نہ ہوں گی۔" وہ خیال کرنے لگا کہ زبیدہ کی اس میں بڑی زیادتی ہے۔ "انہیں اپنی صحت کی خرابی کا کوئی احساس ہی نہیں۔! اتنا نہیں سمجھتیں کہ میں کب تک ان کی خاطر اپنی مسرتیں پامال کرتا رہوں گا۔ یہ عورتیں سچ مچ بڑی خود غرض ہیں اور ساتھ ہی ناسمجھ بھی۔"

نئی ماما کا گداز جسم ذاکر کے تصور پر منعکس ہوگیا۔ وہ اسے اپنے نہایت قریب محسوس کرنے لگا۔ ایک گہری لذت کی سرشاری اس پر طاری ہوگئی۔ جیسے وہ تصور میں اسے بھینچ رہا ہو۔ پھر اسے زبیدہ کا خیال آگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ پچھلی بیماری میں اگر اس نے زبیدہ کی اتنی اچھی طرح تیمارداری نہ کی ہوتی تو وہ زندہ نہ رہ سکتی۔ زبیدہ کی موت کے خیال سے وہ سہم گیا۔ "وہ زبیدہ کے بغیر کس طرح زندہ رہ سکتا تھا۔" اس نے سوچا۔ "ان کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ کیوں نہیں میں ان کو سمجھا کر راضی کر لوں۔

وہ دل سے کبھی راضی نہ ہوں گی۔ ان کی صحت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔" اس کے چہرہ پر ناامیدی کی شکستگی چھا گئی۔

دن کی مصروفیتوں سے علیحدہ ہوتے ہی ذاکر کا دماغ خیالات کے ادھیڑ بن سے اُلجھنے لگتا۔ رات کے سناٹے میں جب زبیدہ اس کے پہلو میں بے خبر سوئی ہوتی نئی ماما کا تصور ذاکر کو چھیڑنے لگتا۔ نیم بے خوابی میں زبیدہ پر اُسے نئی ماما کا دھوکہ ہوتا۔ اور وہ اسے اپنی آغوش میں محسوس کر کے کامرانی کی مسرتوں سے لذت گیر ہونے لگتا۔ لیکن بیداری کے بعد اس کی لطف اندوزیاں کافور ہو جاتیں۔ نئی ماما کے قریب پہونچ جانے کا ارادہ دفعتاً اس کے اندر اُبھر آتا۔ اور اس کے پاؤں بستر سے اُترنے کے لئے مچلتے ہوئے سے محسوس ہونے لگتے۔ لیکن زبیدہ کا خیال اس کے ارادہ پر پانی پھیر دیتا۔ "شاید ان کی نیند ٹوٹ جائے!"

"تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی نئی ماما کی ہمارے گھر میں کوئی ضرورت نہیں۔ جب ایک ماما تھی اس وقت بھی مجھے خود اتنا ہی کام کرنا ہوتا تھا، جس قدر اب۔ اس نے پہلے کبھی نوکری کی ہی نہیں۔ آپ سے کوئی کام کرنی نہیں ہے اور میری عادت نہیں کہ ایک کام کے لئے بار بار کہوں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اُسے علیحدہ کر دوں۔" زبیدہ نے ایک دن ذاکر سے مشورۃً کہا۔

"بھئی اس قسم کے معاملہ میں مجھ سے رائے نہ لیا کرو تو اچھا ہے۔" ذاکر نے بے مروتی سے جواب دیا۔ زبیدہ نے اسے محسوس کیا۔ "تمہیں تو خود فضول کام کرنے کی عادت ہے۔ اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں۔ دوا بھی تو نہیں کھاتی ہو۔ مرض بڑھ جاتا ہے تو خود بھی پریشان ہوتی ہو اور مجھے بھی بھگتنا پڑتا ہے۔"

"میں نے آپ کو کب کہا کہ میری بیماری کے پیچھے آپ اپنے کو پریشان کیجئے؟" زبیدہ نے غمناک آواز میں سوال کیا۔ "میں تو برابر کہتی ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کیجئے۔ میری قسمت میں بیماری لکھی ہے۔ میں بھگتوں گی۔ آپ خواہ مخواہ اپنے سر

پریشانی لے لیا کرتے ہیں۔ اب سے بیمار پڑوں گی تو آپ کو خبر تک نہ ہونے دونگی۔"
زبیدہ نے آخری جملہ رکتے رکتے کہا۔ اس کی آواز بھرانے لگی تھی اور اس کی آنکھوں
میں آنسوؤں کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"بس نہیں تو ذرا ذرا سی بات بُری لگ جاتی ہے۔" ذاکر یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا

"ماما چلی جائے گی۔" ذاکر سوچنے لگا۔ "اچھا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔
لیکن بے چاری بے سہارا ہو جائے گی۔ ان کا یہ صریح ظلم ہے۔ ایسا ہی تھا تو پہلے ہی
گھر میں پناہ نہ دینی تھی۔ اب اس طرح اسے علٰحدہ کر دینا! بڑی نامناسب بات ہے۔
بیچاری کہاں بھٹکتی پھرے گی۔" اس نے ارادہ کیا کہ وہ ماما کو علحدہ کرنے سے زبیدہ
کو منع کر دے۔ لیکن پھر اُس نے ارادہ بدل دیا۔ "وہ کیا سمجھیں۔ میں نے کبھی پہلے
دائی ماما کے معاملہ میں دخل نہیں دیا۔ وہ جانیں اور اس کی قسمت جانے۔ واقعی میں
کیوں اس کے معاملہ میں دخل دیتا پھروں۔ انسانی ہمدردی بھی تو ایک چیز ہے۔
ایک بے کس لڑکی کو اس طرح بے گھر کر دینا۔ جوان ہے خوب صورت۔ کتنے بدمعاش
اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔" ذاکر کی آنکھیں حریصانہ ہو رہی تھیں۔ جیسے بھوکا خدمت گار
دوسرے مالک کے دسترخوان کو تک رہا ہو۔ "اس کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ وہ ضرور
اسے علحدہ کر دیں گی۔" ذاکر نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی کی عزیز ترین چیز اس سے
چھینی جا رہی ہو۔ اس کے اندر بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ ماما کا حسین معصوم چہرہ اس
کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ ذاکر کو اس پر غائت ترس آنے لگا۔ لیکن زبیدہ سے
ماما کی سفارش کرنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

ذاکر کی گفتگو کی تلخی پر زبیدہ کو صدمہ سے زیادہ اچنبھا ہوا۔ ذاکر اس کے ساتھ
اس طرح کی ترش روئی کا عادی نہ تھا۔ اور وہ بھی بے سبب۔ "ماما کا علیحدہ کیا جانا
شاید انہیں پسند نہیں۔" لیکن کیوں؟ جواب سے پہلے ہی یہ سوال اس کے معصوم
دماغ سے کھو گیا۔

زبیدہ نے ماما کو علیٰحدہ نہ کیا۔ ماما ذاکر کی ملتفت نظروں کی رفتہ رفتہ عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اور زبیدہ سے آنکھیں بچا کر وہ بھی اکثر ذاکر کو دیکھ لیا کرتی۔ پہلے تو دونوں کی نگاہیں ملتے ہی جھپک جاتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک دوسرے کو دیر تک تکنے لگے تھے۔ جیسے دونوں نگاہوں کے تار آہستہ آہستہ منسلک ہوتے جا رہے تھے۔ نگاہوں کے جلو میں اب چہرہ کی مسکراہٹ بھی نمایاں ہونے لگی تھی اور بے زبانی راز و نیاز کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ذاکر بے سبب بھی اب زنانہ مکان میں دیر تک رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی زبیدہ کی وقتی غیر حاضری میں وہ ماما سے چٹکیاں بھی لینے لگا تھا۔ ماما اب تک زبان سے کچھ نہ بولتی تھی لیکن ذاکر کی چھیڑ چھاڑ کا جواب وہ ایک خوش آیند مسکراہٹ سے دے دیا کرتی جس سے ذاکر کا شوق اور بھڑک اُٹھتا۔

زبیدہ ذاکر کے معمولات کا فرق محسوس تو کر رہی تھی۔ لیکن اب تک اُسے اس تغیر میں خطرہ کی جھلک نہ دکھائی دی تھی۔ اکثر و بیشتر تو اسے یہ مغالطہ رہتا کہ ذاکر اس کی صحت کی خرابی سے متاثر ہو کر اس کی صحبت اور دل جوئی میں اب کچھ زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ ماما سے اُسے دن بہ دن نہ معلوم کیوں چڑھ سی ہوتی جا رہی تھی۔ بات بات پر وہ اس سے غصّہ کرنے لگتی۔ اس کے ہر کام میں اسے کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا۔ اس کی ہر بات پر وہ نکتہ چینی کرتی اور اس کے ہر انداز پر کوئی نہ کوئی اعتراض، اس کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا زبیدہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ماما اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی لیکن اس کا اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑتا۔ رفتہ رفتہ اس کی خودداری مُردہ ہونے لگی۔ اور وہ بے حس اور بے حیا بن گئی۔

زبیدہ کسی معمولی قصور کے لئے نئی ماما پر خفگی کا اظہار کر رہی تھی کہ ذاکر مکان میں داخل ہوا۔ ماما گردن جھکائے مالکہ کی جھڑکیاں خموشی سے سُن رہی تھی۔ ذاکر کی آہٹ پا کر دونوں کی توجہ اس کی جانب منعطف ہو گئی۔ خادمہ کا چہرہ ذاکر کو نہایت معصوم اور بے گناہ دکھائی دیا۔ زبیدہ اُسے نہایت تشدد پسند اور شقی القلب

معلوم ہوئی۔

"کیا حشرات مچا رکھا ہے۔؟" ذاکر نے زبیدہ کی طرف خشمگیں نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بیماری نے تمہیں کافی بدمزاج بنا دیا ہے۔ جب دیکھو دائیوں پر غصہ غضب کرتی رہتی ہو۔ ماما رکھنے کا خود سلیقہ نہیں۔ بات بات پر ان کے پیچھے لگی رہتی ہو۔ دائیوں سے لڑنے کے علاوہ کسی دوسری بات سے تمہیں دلچسپی بھی ہے بس ہر وقت انہیں کے معاملوں میں لپٹی رہتی ہو۔" ذاکر بڑبڑاتا ہوا کوٹھے پر چلا گیا۔

زبیدہ دم بخود ہو گئی۔ ذاکر کے تیور، اس کی گفتگو کا نشتر زبیدہ کے لئے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ ایک حادثہ! اس کی گھبرائی ہوئی نگاہیں ماما کے چہرہ سے ٹکرائیں وہ اسے بشاش اور مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ زبیدہ کے چہرہ پر مردنی چھا گئی۔ اس کے جسم کا خون جم گیا۔ اور ایک بے جان پتلے کی طرح اس کے پاؤں زمین سے چپک گئے۔

اوپر پہونچ کر ذاکر اپنی اس اضطراری حرکت کا جائزہ لینے لگا۔ "مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔" اس نے سوچا۔ "ان پر کافی اثر ہوا ہوگا۔ خانگی معاملات میں میں کبھی ان سے اس طرح پیش نہ آیا تھا۔ بدمزاج ہوتی جا رہی ہیں پہلے تو اس طرح دائیوں سے جھگڑنے کی انہیں عادت نہ تھی۔ بیچاری کی صحت بھی تو خراب ہے۔ آئے دن کا روگ آدمی یونہی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

اسے زبیدہ پر ترس آنے لگا۔ "مجھے ماما کے مقابلہ میں ان سے اس طرح نہ بولنا چاہئے تھا۔ ان کے دل پر سخت چوٹ لگی ہوگی۔ جواب میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکیں۔ بڑا صدمہ پہنچا ہوگا۔ میں نے غلطی کی۔ تنہائی میں سمجھا دینا تھا۔ سمجھدار کافی ہیں۔ کبھی بھی کوئی کام انہوں نے میری رضامندی کے خلاف نہیں کیا۔ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ اس طرح پیش نہ آنا چاہیے تھا۔" ذاکر پر انفعال کی

ایک گہری کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کا ضمیر اسے نشتر چبھانے لگا۔ وہ کافی دیر تک اس ذہنی اذیت میں مبتلا رہا۔ پھر روزمرہ کے کاموں میں لگ کر اس واقعہ کو اس نے دماغ سے فراموش کر دیا۔

زبیدہ کی ناقابل اعتبار صحت پر ذاکر کے برتاؤ کا گہرا اثر پڑا۔ وہ فطرتاً غائت ذکی الحس تھی۔ اس پر صحت کی مسلسل خرابی نے برداشت کی قوتیں اس سے چھین لی تھیں۔ بیماری کے کسی حملہ نے کبھی اسے ایسا صدمہ نہ پہونچایا تھا۔ جیسا اس دن کے واقعہ سے ہوا۔ رات بھر اس پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ جیسے کوئی اپنی موت کے خواب سے جاگا ہو۔ اس کی نیند بالکل اچاٹ رہی اور اس کے سارے جسم میں سنسنی سی محسوس ہوتی رہی۔ گو ذاکر پر اس نے اپنا اضطراب ظاہر نہ ہونے دیا اور مصنوعی طور پر اپنے کو خوش دکھاتی رہی۔

زبیدہ کو پھر ہلکی حرارت شروع ہوگئی۔ اس کی بھوک رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور طبیعت گری گری سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن ظاہراً وہ اپنی صحت کے اس بتدریج انحطاط سے متاثر نہ ہوئی تھی۔ صحت کا بگاڑ اب تقریباً اس کی روزمرہ زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ اور جب تک وہ اسے کھیپ سکتی اپنے آپ کو زیر نہ ہونے دیتی۔ جب مرض کافی زور پکڑ لیتا اور برداشت اس کی قوت سے باہر ہو جاتی تو اسے اپنے بیمار ہونے کا احساس پیدا ہوتا اور علاج و تدبیر شروع کی جاتی۔

ذاکر کچھ دن سے زبیدہ کی صحت کا فرق محسوس کر رہا تھا۔ لیکن زبیدہ نے اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ اس کی صحت میں کوئی قابل توجہ خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی وہ خود بھی اب اسے بہت زیادہ اہمیت دینے کا عادی نہ رہا تھا۔

رفتہ رفتہ زبیدہ کی صحت کا نمایاں فرق ذاکر کو کھٹکنے لگا۔ اور اس نے زبیدہ کے علاج کی طرف توجہ شروع کر دی۔ زبیدہ کو بھی باضابطہ مریض بن کر پلنگ پر گر جانا پڑا۔

ایک روز زبیدہ کی علالت نے مہلک صورت اختیار کرلی۔ بخار دفعتاً بہت تیز ہوگیا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ ذاکر بہت گھبراگیا۔ اس نے کمال احتیاط کے ساتھ تیمارداری شروع کردی۔ دن بھر اپنے ہاتھ سے زبیدہ کے سر پر برف کی ٹوپی رکھتا رہا۔ اسے رہ رہ کر ڈر پیدا ہورہا تھا کہ کہیں زبیدہ اس دفعہ مرض کی شکار نہ ہوجائے۔ اس خیال سے اس کے دل و دماغ میں غم واندوہ کا دریا اُمڈا آرہا تھا۔ زبیدہ کی نیک طبیعت، اس کی اعلیٰ سمجھ، ذاکر کی دلداری کا خیال، اس کے آرام و عافیت کی فکر، یہ ساری باتیں اس کے دماغ کے سامنے چکر لگا رہی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ زبیدہ اور اس کی ساری خوبیوں سے وہ محروم کر دیا جانے والا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ زبیدہ کے بغیر اس کی زندگی بے معنی ہوجائے گی۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا پر تاریکی چھا جائے گی۔ وہ جینے کے قابل نہ رہ سکے گا۔ "زبیدہ کے بغیر وہ کس طرح زندگی گزار سکے گا؟' اس نے خیال کیا کہ زبیدہ کے بعد وہ دنیا سے قطع تعلق ہوجائے گا۔ زندگی کی لذّتوں سے بیگانہ۔ وہ دوبارہ ازدواجی زندگی کا مُنہ نہ دیکھے گا۔ اور ایثار و خدمت کی بلند پایہ مصروفیتوں میں اپنے آپ کو گُم کر دے گا۔

شام سے زبیدہ کا بخار اُترنے لگا۔ لیکن ابھی اسے ہوش نہ ہوا تھا۔ ذاکر اسی سرگرمی سے اس کے سرہانے بیٹھا سر پر برف کی ٹوپی رکھ رہا تھا۔ رات کے دس بجے زبیدہ نے آنکھیں کھولیں۔

"آپ ابھی تک بیٹھے ہوئے ہیں؟" اس نے خفیف اور مضمحل آواز میں کہا۔ "آپ جاکر سو رہیئے۔"

"میں سوؤں گا۔ تمہاری طبیعت اب اچھی ہورہی ہے نا۔" ذاکر نے مشتاقانہ زبیدہ سے سوال کیا۔

"میں اچھی ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ جاکر سو رہیئے۔" زبیدہ نے چہرہ پر

مسکراہٹ اور صحت کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

ذاکر کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے زبیدہ کے گال پر گر گئے۔ زبیدہ نے اپنی کمزور نگاہیں ذاکر کی طرف اٹھا کر اسے تسلی کی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا اٹھی تھیں۔ ذاکر نے وارفتگی میں اپنا چہرہ زبیدہ کے گرم گالوں کے قریب کر دیا۔ اس کی آرزوؤں کی ساری دنیا زبیدہ کے بیمار چہرہ میں سمٹ آئی تھی۔ زبیدہ اس وقت اُسے بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی جنّت کی حور۔

تھوڑی دیر میں زبیدہ کو نیند آ گئی۔ ذاکر نے محسوس کیا کہ اس کا بخار کافی اُتر چکا تھا اور برف کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اس کا خوف اب جاتا رہا تھا۔ اور اسے غایت مسرت تھی کہ زبیدہ اُسے واپس مل گئی تھی۔ زبیدہ اس کی چہیتی بیوی!

اس نے ارادہ کیا کہ زبیدہ کو ماما کی نگرانی میں چھوڑ کر خود تھوڑی دیر کے لئے سو رہے اور ماما کو آواز دینے کی غرض سے آہستہ سے کمرہ سے باہر نکلا۔ اس نے دھیمی آواز سے ماما کو پکارا۔ نئی ماما جاگ رہی تھی۔ آواز سنتے ہی بازو کے کمرہ سے نکل کر ذاکر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ذاکر اُسے ضروری ہدایت کرنے کی غرض سے اس کے قریب ہو گیا۔ چاندنی میں اس کی آنکھیں ماما کی نظروں سے دوچار ہو گئیں۔ اس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ ماما سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے ماما کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اضطراری طور پر اس کے ساتھ بازو کے کمرہ میں چلا گیا۔

دوسرے لمحہ میں اس کا ہاتھ ماما کی گردن میں حمائل ہو چکا تھا اور ماما اس کی آغوش میں تھی!

(معاصر) ۱۹۴۲

جھوٹی بھوک

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب بھوک لگتے ہوئے بھی کھانا نہیں کھایا جاتا۔ جب تک کھانا سامنے نہیں ہوتا پیٹ میں آگ سی لگی ہوتی ہے۔ لیکن جب اچھے سے اچھا کھانا بھی سامنے لاکر رکھدیا جاتا ہے تو کھانے کی طرف سے جی اس طرح بھر جاتا ہے جیسے نَومشق شرابی کا دل خمار ٹوٹتے وقت شراب سے۔ لیکن یہ سب پیٹ کی بیماری میں ہوتا ہے۔ اسے پیٹ کی بیماری نہ تھی۔ اس کی صحت کافی اچھی تھی اور گو اسے کھانے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی لیکن وہ وقت پر بھر پیٹ ضرور کھا لیا کرتا تھا۔ اُسے تو من کا روگ تھا۔ اس کے من میں ایک طوفان سا اُٹھتا رہتا۔ ایک مستقل اضطراب کی کیفیت! وہ اپنے اندر ایک تڑپتی ہوئی ہوک سنا کرتا تھا جیسے خلا میں کسی چیز کے گرنے سے ایک تھرتھراتی ہوئی آواز پیدا ہو جاتی ہو، دوستوں کی صحبت میں جب مزہ مزہ کی

باتیں ہوتی رہتیں، حسن وعشق کے قصّے دہرائے جاتے۔ اس وقت بھی اُس کے کان اس کے دل کی آواز پر لگ جاتے جیسے سنسان میدان میں کوئی دور سے اسے پکارنے لگا ہو۔ اس کا خیال بہٹ جاتا اور وہ کھویا کھویا سا نظر آنے لگتا۔

اسے کتابوں کا کافی شوق تھا اور وہ کبھی کبھی دن دن بھر کتابیں پڑھتا رہتا لیکن کتابوں کی دلچسپیاں، اسے صرف عارضی سکون بخش سکتی تھیں، جس طرح انقلابی داستانیں مزدور کے دل کو تھوڑی دیر کے لئے موہ لیتی ہیں۔ وہ اکثر کتابوں سے سخت بیزار ہونے لگتا۔ میز پر اس کے آگے کتابوں کے انبار لگے ہوتے اور وہ گھنٹوں، انہیں سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا رہتا۔ خالی الذہن۔ لیکن اس کے دل میں اضطراب کے نشتر چبھتے رہتے۔ جیسے اس کی رگ رگ میں درد اٹھ رہا ہو۔ وہ کوئی کتاب اٹھالیتا۔ اس کی نظریں دو دو تین تین صفحوں کا طول وعرض طے کرلیتیں۔ لیکن اس کا دماغ جیسے کند ہوگیا ہوتا۔ فہم وادراک کی قوتوں سے محروم۔ وہ اس کتاب کو پرے ڈال کر دوسری کتاب کھولتا لیکن اس کا حشر بھی پہلی ہی جیسا ہوتا۔ پھر اس کی قوت فیصلہ اس درجہ معطل ہوجاتی کہ وہ بہ یک وقت دو دو تین تین کتابیں کھول کر رکھتا۔ ایک کی چند سطریں دیکھنے کے بعد اس کی نظر دوسری کی سطروں پر لگ جاتیں اور پھر پلٹ کر پہلی کی جانب۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے من کی کشتی ساحل سے اکتاکر بیچ سمندر میں ہی ڈھیر ہو رہی ہو۔

وہ ایک شام کافی دیر تک کھلے میدانوں کے چکر کاٹ کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اور گھر کے پھاٹک میں قدم رکھا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ بغل کے کوٹھے پر پڑی۔ ایک کمسن لڑکی کوٹھے کے برآمدہ پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں دوچار ہوکر شرماگئیں۔ وہ اُسے ہی تکتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس مکان میں چند دن پہلے ایک پنجابی کرایہ دار آئے تھے۔ یہ پولس کے دفتر میں ملازم تھے۔

اسے دوبارہ نظر اُٹھانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ گو اس کے پاؤں اضطراری طور پر پھاٹک پر آکر رک گئے تھے۔ "وہ اُسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ شاید اس کی نظروں کو دھوکہ ہوا۔" اس کا جی چاہتا تھا کہ دوبارہ نظر اُٹھا کر اس کی جانچ کرے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اور اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔

لڑکی کا کوٹھا اس کے مکان کی چھت سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ پہلے کرایہ دار نے کوٹھے کے برآمدہ پر چلمن ڈال کر پردہ کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔

لڑکی زیادہ وقتوں میں برآمدہ ہی پر بیٹھی رہتی اور وہ چھت پر پہنچ کر اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ گھر والوں کی آنکھیں بچا کر دیوار کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور اسے دیکھنے لگتا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کے اندھیارے میں کرن پھوٹ گئی ہو۔ جیسے اس کے من کی آواز فضا میں کھو جانے کے بجائے گونجتی ہوئی اس کے پاس لوٹ آنے لگی ہو۔ رفتہ رفتہ اس کا جی صرف نظروں کی تسکین سے اکتا گیا۔ اور گفتگو کی آرزو اس کے دل میں کروٹ لینے لگی۔

ایک دن داروغہ جی خاص اس سے ملنے اس کے گھر آئے۔ وہ ان کی صورت دیکھ کر کانپ سا گیا۔ اسے ڈر پیدا ہونے لگا کہ شاید انھوں نے اپنی لڑکی پر نظر ڈالتے اسے دیکھ لیا ہے اور کچھ کڑوی باتیں کرنے آئے ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اُنھیں کرسی پیش کی۔ داروغہ جی پہلے ادھر ادھر کی بے مطلب سی باتیں کرنے لگے اس کا دم اُلجھنے لگا۔ وہ ان کی باتوں کا مختصر سے مختصر جواب دے رہا تھا۔ داروغہ جی جب اس کی شائستگی، کم گوئی اور فلسفیانہ پن سے مطمئن ہو چکے تو اصل مطلب پر آئے۔ "میری لڑکی" اس کا کان کھڑا ہو گیا۔ گویا کسی نے خطرہ کی گھنٹی بجا دی ہو "آپ نے تو اسے دیکھا ہی ہوگا۔ آپ سے کون پردہ ہے۔ اور صاحب اپنے یہاں پنجاب میں تو آپ لوگوں کے جیسا پردہ ہے بھی نہیں۔ میں نے سنتا آیا تھا کہ بہار جیسے

شریف مسلمان ہندوستان کے کسی صوبہ میں نہیں پائے جاتے۔ خدا کی کسم یکین مانئے بہار آکر میں بھی اس کا کائل ہوگیا ہوں۔ ہاں صاحب تو میں میرٹھ میں تھا۔ رانو کی باضابطہ پڑھائی ہورہی تھی۔ نام تو اس کا رادھیکا ہے لیکن ہم لوگ اُسے پیار سے رانو کہتے ہیں۔ پچھلے سال اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہوتا لیکن میں نے یہاں آجانا ہوا، اور اس کی پڑھائی ادھوری ہی رہ گئی۔ اب ارادہ ہے کہ اس سال آپ کی یونیورسٹی سے امتحان دلوا دوں۔ اسی کمصد سے تو میں آپ کے پاس اس وکت حاضر ہوا ہوں۔"

اس کے چہرہ پر دمک سی پیدا ہوگئی، اس کے دل نے انسپکٹر کا مطلب بھانپ لیا تھا اور اسے انسپکٹر کی بے ربط بے معنی گفتگو میں مزا ملنے لگا تھا۔

"میں نے معلوم ہوا کہ آپ نے اس سال اول درجہ میں ام۔ اے پاس کیا ہے۔" انسپکٹر نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بڑا جی خوش ہوا۔ اور وہ بھی فلسفہ جیسے خشک اور مشکل سبجکٹ میں، واللہ کمال کیا آپ نے۔ یکین مانئے آپ دیکھنے میں انٹرمیڈیٹ اسٹوڈنٹ سے زیادہ نہیں معلوم پڑتے۔ اس کمسنی میں آپ نے ام۔ اے پاس کیا ہوا ہے۔ واہ واہ۔"

انسپکٹر کی آنکھیں اس کے چہرہ کا جائزہ لینے لگیں گویا وہ کمسنی کے علامات ڈھونڈھ کر اپنی حیرت دور کرنا چاہتا ہو۔ وہ شرما گیا۔

"آج کل تو آپ گویا بے شغل ہی ہوں گے۔ ام۔ اے کر لیا وکت آنے سے ملازمت مل ہی جائے گی۔ ڈپٹی کلکٹری تو آپ کی دھری ہے۔ کیا ایج ہے آپ کی؟ بیسواں سال ہوگا۔"

"۱۹۱۰ جون کی میری پیدائش ہے۔"

"آپ سول سروس کے امتحان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟ آپ جیسے نہ آئیں گے تو آئے گا کون۔ ہمارا ایک رشتہ دار گزشتہ سال سول سروس میں آیا ہے کوئی خاص بات نہ تھی اس کے اندر۔ ویسے کچھ ایسا محنتی بھی نہ تھا۔ اس کا پڑھنا

لکھنا بھی کوئی بہت اچھا نہ تھا۔ آپ ضرور امتحان میں بیٹھیے۔ کامیابی کی میں شرط کیے دیتا ہوں۔ آخر سول سروس کے امتحان میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہاں تو میں کہنا چاہتا تھا کہ ادھر آپ کا بھی کوئی خاص شغلہ نہ ہو گا۔ یوں تو آپ کے ہاتھ میں ہر وکت کتابیں ہی دیکھتا ہوں۔ آپ جیسے ہونہار جوان کو دیکھ کر بڑا جی خوش ہوتا ہے میرا۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی گھنی سیاہ مونچھوں کے پیچھے اس کے خوب صورت اور چمکیلے دانت اس طرح جھانکتے ہوئے معلوم ہوئے جیسے گناہ گار اِرادوں کی تہ میں نیکی کا جذبہ۔

انسپکٹر کی پیچ در پیچ گفتگو سے اس کا دم پھر اُلجھنے لگا۔ "شاید وہ اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی کا پیام لے کر آئے تھے۔" اس کے دماغ پر سورج کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ انسپکٹر نے پھر بولنا شروع کیا۔

"تو میری غرض اتنی ہے کہ آپ اپنے کیمتی وکت کا کچھ حصّہ نکال کر ذرا رانو کی پڑھائی کی دیکھ بھال کر لیتے۔ میں نے آپ کا بڑا احسان مند رہوں گا۔ آپ کو جون سا وکت مناسب ہو۔ ہفتہ میں بس دو ایک دن۔ میں آپ کا وکت زیادہ نہیں برباد کراؤں گا۔"

"مجھے کوئی عذر نہیں۔" اس نے اضطراری طور پر جواب دے دیا۔ جیسے وہ اس مسئلہ پر پہلے سے غور کر چکا تھا۔ "سات بجے شام کو آپ کے یہاں آسکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جون سا وکت آپ کو مناسب ہو۔ تو کیوں نہیں آپ آج ہی سے آجائیں۔ میں رانو سے کہہ رکھوں گا۔ وہ کتابیں وغیرہ لے کر تیار رہے گی۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

"پڑھنے کی بڑی شوقین۔ کہتی ہے کہ بابو جی مجھے کسی طرح بی۔ اے تک پڑھوا دو

خدا اس کی خواہش پوری کرے۔ میں کم حیثیت آدمی اور پھر اتنے بال بچے"۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل پڑھائی میں کتنا خرچ ہے۔ آخر پہلے زمانہ میں بھی تو لوگ جاہل نہ رہتے تھے۔ کیسے کیسے عالم بدوان اسی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آج کل تو پڑھانا کیا ہے دیوالیہ بننا ہے۔ اور پھر نتیجہ کچھ نہیں۔ سب آپ جیسے تیز اور ذہین تھوڑے ہی ہیں۔ بی۔ اے پاس کو آج کل پوچھتا کون ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ میرے یہاں ایک ایم۔ اے پاس سب انسپکٹر بجال ہوا ہے۔"

اس نے انسپکٹر کی گفتگو میں گویا اپنی توہین محسوس کی اور اس کے چہرہ کا رنگ پھیکا ہوگیا۔

"جی ہاں"۔ انسپکٹر نے "ہاں" کو کھینچتے ہوئے اور گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"درست فرماتے ہیں آپ۔" اس نے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔

"تو اب اجازت دیجئے۔" انسپکٹر یہ کہہ کر چلا گیا اور وہ سات بجے شام کو اس کے گھر پہونچ گیا۔

رانو سے اس کی آنکھیں پہلے ہی دوچار ہو چکی تھیں۔ اس نے رسمی صاحب سلامت کے بعد پڑھائی کے متعلق پوچھ گچھ کی اور ایک معمر پیشہ ور ٹیوٹر کی طرح اپنا فرض انجام دے کر گھر لوٹ آیا۔

وہ ہفتہ میں دو دن رانو کے گھر جاتا اور بڑے انہماک سے اُسے پڑھاتا۔ یہاں تک کہ رانو کا امتحان ختم ہوگیا۔ اور رانو کے گھر جانے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ لیکن جب امتحان کے بعد رانو کے یہاں جانے والا دن پہنچا تو اُسے بڑی بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے اس کی زندگی میں ایک گہرا خلا پیدا ہونے والا تھا۔ اس کا جی بار بار چاہ رہا تھا کہ اس شام کو بھی رانو کے پاس جائے لیکن اُس نے اپنی طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کی اور سنیما جانے کے ارادہ سے گھر سے نکلا۔ مگر وہ غیر ارادی طور پر رانو کے مکان میں داخل ہوگیا۔ جیسے اس کے پاؤں بہک گئے ہوں یا ان پر کسی

دوسرے کا قبضہ ہوگیا ہو۔

رانو اُسے دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوئی۔ اُسے اس احساس سے بڑی لذت ملی۔ "میں آج آپ کی راہ ہی دیکھ رہی تھی۔" رانو نے اس کے چہرہ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر پلکیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ اب تو تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں۔" اُس نے شک کے لہجے میں کہا جیسے وہ رانو کی زبان سے اپنے بیان کو رد کرانے کا آرزومند ہو۔ "آج تو میں تم سے رسمی طور پر رخصت ہونے آگیا ہوں۔" اس کی نگاہیں زمین کو تکنے لگیں اور اس کے اعضا بے حرکت سے ہوگئے۔ جیسے کوئی دل شکستہ بے روزگار ملازمت کے فیصلہ کا منتظر ہو۔

"کیا کہیں باہر جا رہے ہیں؟" رانو کے چہرے پر استعجاب و شرارت کی آمیزش سے ایک دلکش رنگ پیدا ہوگیا۔

"نہیں۔ یعنی اب تم سے ملنے کی مجھے کوئی وجہ تو ہے نہیں۔ اب تو ہماری ملاقات کا سلسلہ بند ہوجانا ہی چاہیئے۔"

"واہ۔ آپ میرے ہمسایہ میں رہ کر ہم سے ملاقات بند کیوں کرنے لگے۔ میرا امتحان ختم ہوگیا تو آپ کے آنے جانے میں کوئی حرج تھوڑا ہی ہے۔"

"نہیں۔ حرج تو کچھ نہیں۔" اس کے چہرہ کی ویرانی شگفتگی سے بدل گئی۔

"تو پھر؟ آخر میں بھی تو امتحان کے بعد سے بے شغل ہوگئی ہوں۔ گھر میں کچھ زیادہ کام دھندا میرے لئے رہتا نہیں ہے۔ اور یوں بھی میں گھر کے کام سے اکتاتی ہوں۔ ترکاریاں بناؤ۔ چھالیاں کترو۔ نوکرانیوں سے لڑائیاں کرو۔ ان کاموں میں میرا جی کیوں کر لگ سکتا ہے۔" اس کی آنکھیں شرما کر جھک گئیں اور چہرے پر حجاب نے ایک ریشمی نقاب ڈال دیا۔ "آپ آتے رہیں گے تو آپ سے باتیں کرکے طبیعت بہل جائے گی۔ آئیے گا نا؟" رانو نے التجا اور تحکم کی ملی جلی کیفیت سے

سوال کیا۔ گویا خاطر خواہ جواب حاصل کرنے پر اُسے ایک گونہ قدرت تھی۔

"آؤں گا۔" اس کے منہ سے یکبارگی نکل گیا۔

"ویسے تو میں بھی گویا بے شغل ہی ہوں۔" اس کے چہرہ پر تمتماہٹ اور بالیدگی سی پیدا ہوکر رفتہ رفتہ مٹ گئی۔ وہ کچھ اور کہنے کی جراءت نہ کرسکا۔

وہ تقریباً ہر ہفتہ رانو کے یہاں جاتا رہا۔ کبھی خود سے اور کبھی رانو کے بلانے پر آج کل رانو کے پاس اس کا جی پڑھائی کے دنوں سے زیادہ لگتا تھا۔ رانو بڑی باتونی تھی۔ پرانے گھریلو قصے، خاندانی جھگڑوں کی داستانیں اپنے والدین کی زندگی، ان کے آپس کے تعلقات رانو کی گفتگو کا بیشتر حصہ ہوا کرتے۔ وہ رانو کی باتیں غایت دلچسپی سے سنتا جیسے وہ فرائڈ کی کسی نئی کتاب کا مطالعہ کررہا ہو۔ اور رہ رہ کر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ذریعہ ان میں ترتیب اور سجاوٹ سی پیدا کرتا جاتا۔ رانو بھی ایک ریشمی مسکراہٹ کے نقاب سے اسکی طرف دیکھ لیتی اور زیادہ گرم جوشی کے ساتھ گفتگو کرنے لگتی۔ کبھی کبھی اس کی مسکراہٹ رانو کی گفتگو میں ایک جادو بھری ہنسی کا وقفہ پیدا کردیتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے تیلیوں کے اشارہ سے مغربی سازیں کسی خاص گت کی روح ڈالی جارہی ہو۔

وہ رفتہ رفتہ رانو سے بے تکلف بنتا جارہا تھا۔ بیچ کی باتوں کے پردہ میں کبھی کبھی پیار اور محبت کے جملے بھی شامل ہوجاتے۔ کچھ رومانی اشارے کنائے۔

"امتحان کی محنت نے تمہاری صحت بگاڑ دی تھی۔ اب تمہارا چہرہ دن بہ دن نکھرا جارہا ہے"۔ "تم آج کل کتنی اچھی لگتی ہو۔ امتحان کی فکر نے تمہیں لاغر بنا دیا تھا۔" "کچھ دنوں میں تمہارا بیاہ ہوجائے گا۔ اس کے بعد تو مجھے بالکل بھول جاؤ گی۔ اسی خیال سے تو میں ابھی تم سے کنارہ کش ہوجانا چاہتا ہوں۔ اور زیادہ تعلقات بڑھ جائیں گے تو دکھ بھی ویسا ہی ہوگا۔"

"میں کیوں آپ کو بھولنے لگی؟ آپ البتہ مجھے دھیان سے نکال دیں گے۔ مسز آجائیں گی تو پھر میں بھولے سے بھی یاد نہ آؤں گی۔" رانو ٹھنڈی سانس لے کر کہتی

لجائی لجائی نگاہوں کے ساتھ۔

"تم اپنی ایک تصویر مجھے دو گی۔ کون جانے پھر تمہاری صورت بھی دیکھ سکوں!"
وہ لمبی سانس لے کر کہتا "تصویر سے یاد تو قائم رہے گی۔"

"یہ سول میرج کیا ہے؟" ایک دن رانو نے اس سے شرماتے ہوئے سوال کیا
اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سول میرج کے مفہوم سے واقف تھی۔
"دو مختلف مذہب والوں کے درمیان شادی۔"
"جیسے۔" رانو نے بناوٹی نادانی سے سوال کیا۔
"جیسے کسی ہندو مرد اور مسلمان عورت کی شادی۔"
"اور اگر مسلمان مرد اور ہندو عورت کی شادی ہو تو اسے سول میرج نہ کہا
جائے گا۔"
"کیوں نہیں۔"
"او۔ اسی سے مسٹر آصف علی کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہوں نے 'سول میرج'
کیا ہے۔ ان کی بیوی بھی تو ہندو ہیں نا۔ بڑے بھاری لیڈر ہیں نا وہ۔ اور ہمایوں کبیر
صاحب جو کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے بھی تو سول میرج کیا ہے۔
سنتے ہیں بڑے قابل آدمی ہیں۔ وہ بھی شاید فلسفہ....."
"ہاں۔" اس نے بات کاٹ کر کہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ہمایوں
کبیر ہو۔ اس کے چہرہ کی بالیدگی اور سینہ کا ہلکا تناؤ اسے ظاہر کر رہا تھا۔
"معلوم ہوتا ہے سول میرج اب ہندوستان میں بہت رائج ہوتا جا رہا ہے۔"
"نہیں۔ ابھی تو بہت کم ہوتا ہے۔"
اُس رات وہ گھر لوٹا تو سول میرج کا خیال اس کے دماغ میں دیر تک چکر کاٹتا
رہا۔ "شاید رانو مجھ سے سول میرج کرنے کو تیار ہے۔" اُس کے چہرہ پر چمک پیدا

ہو گئی۔ وہ پہلے ہی سے رانو کی گفتگو میں پریم کا رس محسوس کر چکا تھا۔ اسے اب کامل یقین تھا کہ رانو اس سے انتہا محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اس کی خاطر ہر مشکل جھیلنے کو تیار تھی۔ خود اس کا دل بھی نورانو کے لئے بیتاب رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا خلا تو رانو کے وجود سے ہی پر ہوا تھا۔ اس کی تڑپتی ہوئی ساحل ناآشنا زندگی رانو ہی کی بدولت تو بہتر ہوئی تھی۔ " سول میرج! کتنی انوکھی ترکیب ہے۔ شادی کا کتنا اچھوتا اور غیر عامیانہ طریقہ۔" ہمایوں کبیر کا وجود اس وقت اُسے ہندوستان کے لئے مایہ ناز معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی شخصیت اُسے کانٹ اور ہیگل سے کہیں زیادہ ممتاز نظر آ رہی تھی۔ " ایک آزاد اور بلند شخصیت والا ہی تو سول میرج کر سکتا ہے۔" اس نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھاتے ہوئے سوچا۔

" رانو۔ اس کی تخئیل کی دنیا۔ اس کی بن سکتی تھی۔" وہ اس خیال کی لذت سے نشہ سا محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک ہفتہ سے رانو کے گھر نہ جا سکا تھا۔ وہ عرصہ سے اپنے دوستوں کو بھلائے ہوئے تھا۔ ان کے یہاں آمد و رفت کا سلسلہ یکلخت بند کر کے۔ اس کے بچپن کے ساتھی! " ان کی صحبت میں اس نے زندگی کے کتنے سنہرے لمحے گزارے تھے۔" زمانہ تعلیم کے سارے واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ ماضی کے شاہکار مرقعے۔" اس وقت وہ زندگی کی ہر فکر سے آزاد تھا۔ دنیا کے ہر دکھ درد سے بے نیاز اس کے دوست اس کے لئے سب کچھ تھے۔ وہ ان سے دل کھول کر ملتا تھا۔ ہر رسمی بندش اور رواجی تکلّف سے بے پروا۔ انہیں بھلا کر وہ ایک بڑی حق تلفی کا مرتکب ہوا تھا ایک ناقابل تلافی گناہ۔" وہ انفعال کی چبھن محسوس کرنے لگا۔ اس کی شام دوستوں کے یہاں جانے میں گذرنے لگی۔ ان سے ملنے ملانے میں۔

وہ کچھ دنوں سے رانو کے یہاں نہ جا سکا تھا۔ وہ ہر روز جانے کو سوچتا لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت اسے روک دیتی۔ اسی طرح دو ہفتے گذر گئے۔ یہ ایک غیر معمولی مدت تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ نہ جا سکا۔ ایک شام کو رانو نے اسے بلوا بھی بھیجا اور اس نے جانے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن پھر بھی وہ جا نہ سکا۔

اسی طرح دن گذرتے جا رہے تھے اور اسے رانو سے ملنے کا موقع نہ حاصل ہو سکا تھا۔ اب ہر دوسرے تیسرے رانو اسے بلوا بھیجتی۔ وہ ہر بار وعدہ بھی کر لیتا لیکن کوئی نہ کوئی مجبوری حائل ہو جاتی۔

رانو بڑی منت سماجت سے اسے بلواتی۔ پردہ پردہ میں اپنی بے چینی کا اظہار کرتی۔ لیکن پھر بھی وہ نہ جا سکا تھا! یہاں تک کہ اسے اپنے آپ سے شرم سی آنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ رانو اس سے نہ آنے کا سبب پوچھے گی۔ تو وہ کیا جواب دے سکے گا۔ یہ احساس بھی اب اسے جانے سے روکنے لگا تھا۔

اس طرف پھر اسے کتابوں سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لائبریری سے وہ نفسیات کی چند نئی کتابیں لے کر آیا تھا۔ اور صبح شام ان کے مطالعہ میں مصروف ہو رہا تھا۔

وہ سرِ شام سے بیٹھا رات گئے دیر تک کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ بغل کے کمرہ میں کلاک نے بارہ کے گھنٹے بجائے۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے اور اس کی نظر کتاب سے اٹھ گئی سامنے دروازے پر رانو کھڑی تھی۔ اسے سخت اچنبھا ہو رہا تھا۔ "رانو یہاں کیسے ہو سکتی ہے؟" اسے خیال ہوا کہ شاید کتاب دیکھتے دیکھتے اسے نیند آ گئی تھی اور وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا بیٹھا رانو کی طرف تک رہا تھا۔ رانو آہستہ قدموں سے کمرہ میں داخل ہوئی اور اس کے قریب رک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ سے وحشت اور پریشانی برس رہی تھی۔ جیسے وہ خون کر کے آئی ہو!

"تم اس وقت یہاں کس طرح آ گئیں۔؟" اس نے ابرو پر شکنیں پیدا کرتے ہوئے سوال کیا۔

رانو بت بنی کھڑی رہی۔

"یہاں تمہیں کوئی دیکھ لے تب۔"

رانو کے لب نہ ہل سکے۔ جیسے الفاظ اس کی حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

"رونو! تم یہاں کس لئے آئی ہو۔ اتنی رات گئے۔" اس نے تحکمانہ انداز میں سوال کیا۔

"آپ سے معافی مانگنے۔ آپ جو مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔" رانو کی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بندھ گئے۔

"میں؟ تم سے؟ بے سبب خفگی؟"

"آپ ضرور مجھ سے رنج ہیں۔ تب ہی تو آپ نے مجھ سے ملاقات ترک کر دی ہے۔"

"نہیں! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور اس غلط فہمی میں تم وہ کر گذریں جو تمہیں نہ چاہئے تھا۔ اس وقت لوٹ جاؤ۔ میں تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں لوٹ جانے کو نہیں آئی ہوں۔"

"تو پھر؟"

"آپ سب کچھ جانتے ہیں، آپ ہی نے تو مجھے سب کچھ بتایا ہے۔" اس کی آواز بیٹھنے لگی۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"نہیں، آپ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔" رانو نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ اُسے دیکھ کر ڈر گیا۔

"جاؤ ورنہ میں شور کروں گا، جاؤ! جاؤ!"

"کمینے۔"

رانو چلی گئی۔ "کمینے" اس کے دماغ میں دیر تک گونجتا رہا۔ جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اسے پکار پکار کر کہہ رہا ہو کمینے!

(معاصر) ۱۹۴۲

لذّتِ آزار

"ماں سندری بُوا نے لوٹا پٹخ کر پچکا دیا۔" رجھنی دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آکر شکایت کرنے لگی۔

"بُلا تو اس مال جادی کو۔ ای تو میرا گھر ناس کر دے گی۔"

سندری کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ کوئیں سے برتن مانجھ کر واپس آرہی تھی۔ برتنوں کو تلے اوپر بٹھا کر اس نے سر پر رکھ لیا تھا۔ رجھنی ساتھ تھی۔ چلنے میں سندری کے کاندھے سے آنچل سرک کر زمین پر لوٹنے لگا۔ رجھنی اُسے پکڑ کر گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچنے لگی۔ کھینچا تانی میں لوٹا کھسک کر زمین پر آرہا۔ سندری کو چچی سے اس دن بہت مار کھانا پڑی۔ اپنے قصور سے زیادہ۔ 'بے گناہ' رجھنی کا نام لگانے پر۔

سندری ۶ سال کی تھی کہ اس کی ماں نے مرتے وقت اسے چچی کو سونپ دیا تھا۔

جب سے وہ چچی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس عورت کے اپنے کئی بچے تھے۔ اور اُن کے رہتے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سندری کی پرورش کا بار بلا معاوضہ اپنے سر لے لیتی۔ بچوں کے کپڑے دھونا۔ ان کے کھانے کے برتن صاف کرنا اور پھران کی جھڑکیاں۔ ان کی بے سبب مار پیٹ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ انہیں خدمتوں کی بدولت سندری کو دو وقت کھانا مل رہا تھا۔ ان کی انجام دہی میں اک ذرا کوتاہی سندری کو مار اور جھڑکیوں کے علاوہ فاقہ کی سختی برداشت کرنے پر مجبور کر دیتی۔

پڑوس والے کہتے کہ سندری گلاب کے پھول کی طرح خوب صورت ہے۔ سندری کی چچی کو ان کی یہ بات کبھی اچھی نہ لگتی۔ وہ ہمیشہ سندری کے مقابلہ میں اپنی بیٹی کی خوش سلیقگی اس کی فرزانگی، اس کا بھولا پن اور موہنی صورت کا ذکر کرنے لگتی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ سندری کی بیتی پر رحم کھا کر یہ لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ اور پھر " وہ حسد سے بھی تو ایسی باتیں کرتے تھے۔ فقیر زادی سندری سے انہیں کس بات پر ڈاہ ہوتی "۔ اُسے سندری سے نفرت سی پیدا ہو جاتی۔ آخر پڑوس والوں کی اس نا انصافی کا بدلہ تو اُسے کسی سے لینا ہی تھا۔ وہ سندری کے قصور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتی اور اُسے سزا و ملامت کا نشانہ بنا کر اپنے دل کا بخار ہلکا کرتی۔ سندری کے لئے سب سے سنگین سزا پیٹ کی مار ہوا کرتی۔ اس کی چچی دن دن بھر اس کا کھانا بند کر دیا کرتی۔ یہی سزا سندری کے لئے حقیقی طور پر صبر آزما ہوا کرتی۔ ورنہ جھڑکی اور مار کی تو وہ کب سے عادی ہو چکی تھی۔ جس طرح ہر صبح اس کی نظریں سورج کی کرنوں سے دو چار ہوتیں۔ اسی طرح اس کا کوئی دن لعن طعن کی باتوں، گالیوں اور تھپڑ سے خالی نہ جاتا۔ سورج کی کرنوں ہی کی طرح اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بلکہ بسا اوقات تو یہ مار اور جھڑکیاں اس کے لئے نوید جاں بخشی بن جاتی تھیں۔ وہ ان کی مشتاق سی رہتی جس دن اس کی چچی کا غصہ تیز ہو جاتا اور اُسے اپنے ہاتھ اور زبان کی کارکردگی پر اعتماد نہ رہتا وہ خوشی سے دو، دو وقت سندری کا کھانا بند کر دیتی۔ سندری کوئی قصور

کرتی تو چچی کی گالیوں اور مار کی بے چینی سے منتظر رہتی اور اگر کبھی وہ ان سے محروم رہ جاتی تو پیٹ کی مار کے تصور سے اس کے جسم کا سارا خون خشک ہو جاتا۔ اُف! دو دو وقت کا فاقہ! گھر کے سارے لوگ اس کی نظروں کے سامنے بھر بھر پیٹ کھاتے ہوتے۔ وہ ان کے آگے کھانے کی چیزیں لا کر رکھتی۔ جوٹھے برتن صاف کرتی، لیکن بچا کھچا کھانا اُسے دکھا کر گلی کے کتوں کی نذر کر دیا جاتا۔ وہ پیٹ کی آگ پر پانی اُنڈیل کر رہ جاتی۔ اس سزا کے تصور سے وہ کانپ اٹھتی تھی۔ "چچی اسے مار مار کر اَدھ موا کر دیتی لیکن بچا کھچا کھانا تو دے دیتی۔" رفتہ رفتہ سندری کو چچی کی مار اور جھڑکیوں سے اُنس سا ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں کی بدولت تو اسے کھانا ملتا تھا! ان کی خاطر اکثر اس سے کچھ نہ کچھ بھول چوک ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی ہلکا سا قصور۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے بغیر اُسے آسودگی نہ میسّر ہوتی تھی۔ جیسے کسی کو شراب پی کر گلیوں میں روندے جانے کی عادت پڑ جاتی ہو۔

سندری کا چچیرا بھائی چھکو ماں کا اکلوتا تھا۔ اس کی پرورش گلی کے کتّوں کی طرح آزاد اور بے پروا ہو رہی تھی۔ گھر والوں کی مجال نہ تھی کہ اس کی کوئی ممکن خواہش رد کی جائے۔ وہ جس کو چاہتا مار بیٹھتا۔ جس سے چاہتا اُس کے منہ کا نوالہ چھین کر ہڑپ کر جاتا۔ اس کی بازپرس کوئی نہ کر سکتا تھا۔ خصوصاً سندری تو اس کی مشقِ ناز کے لئے وقف تھی۔ دوسرے بچوں کی شکایتیں کم از کم چھکو کی ماں کے چہرہ پر شکن پیدا کر دیتی تھیں۔ لیکن سندری کی تو مجال نہ تھی کہ لب تک ہلا سکے۔

دوسری خدمتوں کے علاوہ سندری کو اکثر پہروں جاگ کر چھکو کے پاؤں بھی دابنا ہوتا تھا۔ اک ذرا اس کی آنکھیں جھپکیں کہ چھکو کی گالیاں اور بے پناہ چٹکیاں اُسے بیدار کر دیتیں۔

ایک شب سندری حسبِ معمول چھکو کا پاؤں داب رہی تھی۔ گھر کے سارے لوگ سو چکے تھے۔ سندری کو بھی نیند آ رہی تھی۔ لیکن چھکو ابھی تک سویا نہ تھا اور جب تک

نیند اُسے بے دست و پا نہ کر دیتی سندری کو پیر دابتے رہنا تھا۔ پاؤں دابتے دابتے سندری ایکبارگی اونگھ کر زمین پر گر گئی۔ چھکو کو نیند آیا ہی چاہتی تھی۔ آہٹ پاکر وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور سندری کا ہاتھ جھٹکے سے اپنی طرف کھینچ کر مروڑنے لگا۔ پھر اس نے اس زور سے اس کی چٹکی لی کہ سندری مچل کر رہ گئی۔ چھکو نے اسی پر بس نہ کی۔ اس نے سندری کو ایک ایسی لات لگائی کہ وہ چت ہو کر زمین پر گر گئی۔ چھکو اپنی خشمگیں نگاہیں سندری کے بکھرے ہوئے اعضا پر جمائے تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اُسے پہلی بار سندری کے شباب کی خبر ملی۔ اس کے بہیمیہ جذبات ایکبارگی جاگ اٹھے۔ اور وہ بھوکے تیندوے کی طرح سندری پر ٹوٹ پڑا۔ سندری اضطراری طور پر مدافعت کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ چھکو نے اپنے آہنی بازوؤں کی مدد سے اُسے زیر کر لیا اور اس زور سے اُسے اپنے آغوش میں لے لیا کہ سندری کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ سندری بے قابو ہو گئی اور چھکو کی ہوسناکی نے اسے پہلی بار ایک نہایت جانگسل لیکن لذت مآب تجربہ سے آشنا کیا۔

چھکو اسی طرح سندری کے شباب پر چھاپے مارتا رہا۔ اس کے ہر اقدام میں ویسی ہی خشونت اور سخت گیری ہوتی جیسے پھول کو پاؤں تلے روندنے کے بعد اسے پلٹ کر اٹھا لیا جائے۔

سندری پوری جوان ہو چکی تھی لیکن چھکو کی ماں کو ابھی تک اس کے بیاہ کا خیال نہ ہوا تھا۔ شاید اُس کی خدمت گذاری سے فائدہ اٹھانے کی خواہش اس کی چچی کو اس کا سوچ نہ پیدا ہونے دیتی تھی۔ ہمسایہ والیاں اسے ٹوکتی تو یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ " اس کے بیاہ کے سوچ میں تو ہم کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ مگر ہم کیا کریں۔ کہیں سے بات بھی تو آئے لڑکے کا معاملہ ہوتا تو اپنے سے کہیں پیغام بھیجتے۔ کہیں لڑکی والے بھی بات چلاتے ہیں؟ کچھ دنوں تک تو اس جواب سے کام چلتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ محلہ والیوں کو بھی شک ہو گیا کہ چھکو کی ماں سندری کو اپنے گھر کے کام کاج کے لئے بٹھائے رکھنا چاہتی ہے۔ چھکو کی

ماں کو راہ چلتے طعنے ملنے لگے۔ "ہاں رے پرائے کی بیٹی کا تو کو ٹھکو کیا۔ مُفت کی لونڈی مل گئی ہے۔ چلی جائے گی تو گھر کا کام کون سنبھالے گا۔"

چھکو کی ماں اگر سندری کا بیاہ نہ کرتی تو کوئی اس کا کر ہی کیا سکتا تھا۔ کوئی تھانہ پولس کی بات تو تھی نہیں کہ چھکو کی ماں کو مجبور ہو جانا پڑتا۔ پھر سندری اس کی بھتیجی تھی۔ محلہ والیوں کو کیا کہ سندری کا بیاہ ہو یا نہ ہو۔ وہ بن بیاہی رہ کر ان کے بھات پر تھوڑا ہی گذارہ کر رہی تھی؟ پھر بھی اس طرح کے خیالات چھکو کی ماں کے دماغ میں پیدا نہ ہوتے تھے۔ اور اُسے محلہ والوں کی بات پر کان دھرنا ہی تھا۔ لیکن واقعی ننگی بچی سندری سے بیاہ کرنے پر کون آمادہ ہوتا۔ چھکو کی ماں بیاہ کا خرچ اُٹھانے کو تیار نہ تھی۔ اُسے اپنی بیٹی کے بیاہ کا بھی تو خیال تھا۔ گھر میں جو کچھ تھوڑا بہت پسماندہ تھا اس نے بیٹی کے بیاہ کے لئے الگ رکھ چھوڑا تھا۔ ایک جگہ سے بات بھی آئی تو لڑکے والوں نے پہلے ہی سے دان جہیز کی تفصیل دریافت کرنی شروع کر دی۔ چھکو کی ماں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایک ٹکا بھی جہیز میں نہیں دے سکتی۔ "گھر کا بھات کھلا کھلا کر پوس دیا۔ اب کیا اس کے پیچھے گھر بار بیچ کر بھیک مانگتے پھریں؟" بے گہنا زیور کی بہو لے جا کر ناک کٹوانے کو تیار کون ہوتا؟ بات وہیں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پھر کہیں سے کوئی پیام نہ آیا۔ لیکن محلہ والیوں کے اعتراضات کی بوچھار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اپنی صفائی پیش کرتے کرتے چھکو کی ماں کے ناک میں دم آ گیا۔ آخر تنگ آ کر اس نے چپکے چپکے ایک بات پکّی کر لی۔ لڑکا دوہاہ تھا۔ پاس کے گاؤں میں کھیت باری بھی رہی تھی لیکن سب کچھ شراب کے پیچھے تباہ کر چکا تھا۔ اب قلیل تنخواہ پر ایک چھاپہ خانہ میں کام کرتا تھا اور کمائی کا بیشتر حصّہ شراب کی نذر کر دیتا۔

جمائی سندری کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا۔ سندری کی زندگی میں اس اہم تغیر نے بھی کوئی فرق پیدا نہ کیا۔ اسی طرح دن بھر گھر کا کام کرنا، چولھا پھونکنا، برتن مانجھنا، پہر رات گئے تک جمائی کے بدن دابنا اور اس کی گالیوں اور لاتوں کی

تواضع قبول کرتا۔ جمائی جب شراب کے نشہ میں گھر آتا اور اس کی تکا بوٹی کر کے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا تو اُسے چھکو کی دست درازیاں یاد آجاتیں۔ وہ اسی طرح پوری طاقت سے مدافعت کی کوشش کرتی اور اسی طرح وحشیانہ حملوں کے مقابلہ میں زیر ہو کر بے بس ہو جاتی۔ انجام کار اسی لذّت گیر لیکن اذیّت مآب تجربہ کی سرشاری!

جمائی ایک رات بہت زیادہ شراب پی کر واپس آرہا تھا راستہ میں اُسے بے موقع ٹھوکر لگی۔ سر میں سخت چوٹ آئی اور چند دن بیمار رہ کر مر گیا۔

جمائی کی موت کے بعد سندری کی زندگی میں اور زیادہ کٹھنائیاں پیدا ہو گئیں۔ مسلسل فاقوں کی تکلیف سے وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اور اس کا گورا رنگ اس کے پچکے ہوئے گالوں پر کفن کی سی منحوس بے رونقی پیدا کر رہا تھا۔ اس کی رس بھری آنکھوں کی تابانی ناپید ہو گئی تھی۔ اور ان کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ جیسے مفلسی کھنڈر کے سوراخ سے جھانک رہی ہو۔ سندری اس تکلیف و مصیبت کی زندگی سے جلد نجات پا چکی ہوتی، اگر مینا نے اسے بمبئی لے جا کر ایک نئی دنیا میں داخل نہ کر دیا ہوتا۔

سندری اب ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہی تھی جہاں عورت کا حسن اور اس کے اعضا کی دلآویزی اسے انسانیت کی ایک مجبور و مرہون توجہ شخصیت باقی نہیں رہنے دیتی۔ اور اس کی مٹھی میں مرد کی تقدیر ڈال دیتی ہے۔ جیسے پہاڑی مزدوروں کے پاؤں تلے روندے ہوئے کروٹن کو سنہرے گملا کی آب و تاب کسی لکھ پتی کی قیمتی توجہ پر چھاپہ مارنے کے قابل بنا دیتی ہو۔ سندری اس نئے عالم میں بڑی تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہی تھی۔ اس کی تقدیر کروٹ لے رہی تھی۔ جیسے کسی بنجر اور اُجاڑ زمین کے نیچے سے خزانہ نکل آئے۔ اس کے گلا کی فطری موسیقیت کو استاد کی فن کارانہ تعلیم نے بہت جلد چار چاند لگا دیئے۔ اور اس کے نغمے کی مقناطیس بمبئی کے اونچے اونچے محلوں سے زر و جواہر کے انبار کھینچنے لگی۔ سندری کی شہرت فلمی دنیا میں بھی پہنچ گئی اور ایک ممتاز فلم کمپنی نے اس کی فطری ودیعتوں کا خزانہ لوٹنے

کے لئے اُسے ایک بڑی تنخواہ پر رکھ لیا۔

سندری بہت کم عرصہ میں ہندوستان کی مشہور ترین ایکٹریس میں شمار کی جانے لگی۔ اس کے چہرہ کی فنکارانہ تراش اس کے گندمی رنگ کی قیامت خیز ملاحت۔ اس کے اعضاء کا ملکوتی تناسب اس کے انداز کی سحر آگیں کرشمہ سازی۔ اس کی لوچ دار آواز کی بانسری۔ ان ساری خصوصیتوں کے بعد اُس کی باکمال اداکاری! شاید کسی فلم اسٹار کے اندر ان ساری دلآ ویزیوں کے سامان یکجا بہم ہوتے ہوں گے۔ وہ جس وقت فلم کے پردہ پر نمودار ہوتی تو معلوم ہوتا کہ انسانی دماغ کے نازک ترین شہکاروں میں جان پڑ گئی ہے۔ جیسے غیر مرئی تصورات کو گوشت و پوست کے سانچہ میں ڈھال دیا گیا ہو۔ فلمی دنیا میں اسے کوئی سندری کے نام سے نہ جانتا تھا۔ وہ مس اندرا دیوی تھی جس سے دو باتیں کرنے کی تمنّا معصوم سے معصوم دلوں میں بھی کروٹ لینے لگتی۔

سندری کی گھناؤنی شخصیت مس اندرا کے روپ میں اپنے اندر سوسائٹی کے ارمانوں کی دنیا بسائے ہوئے تھی۔ فلمی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے وہ صرف اوباش طبع امراء اور غیر متمدن تجار کی توجہ کا مرکز تھی۔ لیکن اب اس کی صحبت کے چند لمحے ترقی یافتہ اور باوقار شخصیتوں کے لئے بھی باعث ناز تصور کئے جاتے تھے۔ وہ کسی نئے شہر میں چلی جاتی تو اسٹیشنوں پر تماشا بینوں کا ویسا ہی ہجوم ہوتا جیسے سڑک کی برقی روشنی کے گرد پتنگوں کی یورش۔ فلم پرستاروں کے رومان خیز مراسلات کی بارش ہوتی رہتی۔ قلوپطرہ کا روایتی نقشہ الفاظ کے کینوس پر کھینچ کر اس کے حسن کے مقابلہ میں ہیچ ثابت کیا جاتا۔ اس کی آواز کی دل کشی کو ایک حیات آفریں معجزہ کا نام دیا جاتا۔ اس کی لاثانی اداکاری خدائے فن کے اعلیٰ ترین شاہ کار کی حریف بتلائی جاتی سندری رفتہ رفتہ ان اصطلاحات کے معنی سمجھنے لگی تھی۔ فلمستان میں قدم رکھنے کے بعد اس نے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ لیکن ان خطوط سے اسے کوئی دل چسپی نہ پیدا ہوتی۔ وہ انہیں پڑھتے ہی ردی کے ٹوکرے میں پھینک دیتی جیسے وہ

اس کے لئے مفہوم نہ رکھتے ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ان کی کثرت و عمومیت سے اُکتا گئی تھی۔ ان میں بعض خطوط ایسے بھی ہوتے جن کی رومان انگیزی کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سندری کی روح کا کوئی تار بھی ان سے مرتعش نہ ہوتا تھا ـــــــــ

اونچے اونچے عہدوں اور بڑی بڑی پوزیشن کے لوگ سندری کی ملاقات کو آتے۔ اس کی خوب صورتی اور فلمی صلاحیتوں کی پُر خلوص داد دیتے۔ بعض اس کے حسن کی قربان گاہ پر اپنی زندگی نچھاور کرنے کے لئے سر بکف نظر آتے اور اپنا سب کچھ اس کی قدموں پر بھینٹ چڑھانے کا مدعا ظاہر کرتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سندری پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ ایک بے جان پُتلا ہو فلم کے اسٹیج پر اس بجلی کی طرح تھرکتی ہوئی تیتری کو یوں بے حس و حرکت دیکھ کر انہیں سخت حیرانی ہوتی۔ اس کی روح کے لطیف رومانی تار کو متحرک کرنے کے لئے وہ نت نئے طریقے عمل میں لاتے۔ لیکن ان کی ہر کوشش بے اثر ہوتی اور وہ عجیب پشیمانی اور تعجب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے۔ وہ سمجھنے لگتے کہ ان کی باتیں سندری کو ناگوار خاطر ہو رہی ہیں اور وہ خموش ہو جاتے۔ پھر دونوں طرف کی خموشی فضا کو مکدر بنا کر انہیں آمادہ رخصت کر دیتی۔ لیکن انہیں جرأت نہ ہوتی کہ اس بے اعتنائی و عدم توجہ کا سبب سندری سے دریافت کر سکیں۔ رفتہ رفتہ سندری کے اس انوکھے انداز کا چرچا کافی پھیل گیا اور اس کی غیر فلمی زندگی کا جمود اور بے کیفی فلم پرستاروں کے لئے ایک معمہ بن گئی۔

سندری ایک فلم کمپنی کے ساتھ نیا کنٹراکٹ کر کے بمبئی سے کلکتہ منتقل ہو گئی۔ کمپنی کے مینجر نے بڑی جان توڑ کوشش سے سندری کو حاصل کیا تھا۔ سندری کو راضی کر کے مینجر نے کمپنی کے لئے اپنی بے لوث پُر خلوص خدمت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن حقیقت میں مینجر کو سندری سے محبت ہو گئی تھی۔ کمپنی کی رونق بڑھے یا نہ بڑھے دراصل وہ اپنے

دل کی دنیا روشن کرنا چاہتا تھا۔

منیجر رفتہ رفتہ سندری سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ جس روز سے سندری نے کمپنی میں قدم رکھا تھا۔ منیجر کے دل کی آرزوئیں اپنے اظہار کے لئے مچل رہی تھیں لیکن سندری کا حسن اس کی مقبولیت فلمی دنیا میں اس کی پوزیشن یہ ساری باتیں منیجر میں عرضِ مدّعا کی جرأت نہ پیدا ہونے دیتی تھیں۔

منیجر نے ایک شب سندری کو کھانے پر مدعو کیا۔ سندری وقت مقررہ پر پہونچ گئی۔ منیجر نے خلوت کا فائدہ اٹھانے کی غرض سے کسی اور کو نہ بلایا تھا۔ باغ کے صحن میں پُرتکلّف کھانوں سے میز سجی ہوئی تھی۔ سندری منیجر کے روبرو بیٹھی تھی۔ چاندنی کا سفید جال فضا پر پھیلا ہوا تھا۔ اوائل اپریل کی خمار آلود ہوا نشہ کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

منیجر جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ تمنّاؤں کے اُٹھتے ہوئے طوفان نے اس کے دل کی حرکت تیز کر دی تھی۔ کھانے کے درمیان وہ ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ رہا تھا لیکن مطلب کی گفتگو شروع کرنے کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ چاندنی کے پس منظر میں سندری کا حسن اور نکھرا جا رہا تھا۔ منیجر پر رعب سا طاری تھا۔ آخر اس نے ہمّت کر کے زبان کھولی۔

"اندرا دیوی آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ سے ایک بات کہوں۔"

"شوق سے کہئے۔" اندرا نے جواب دیا۔

"آپ بُرا تو نہ مانیں گی؟" منیجر نے رکتے رکتے سوال کیا۔

"میں نے آپ کو پہلی بار 'نئی دلہن' میں دیکھا۔ اُف آپ مجھے کس قدر خوب صورت لگی تھیں۔ لیکن آپ حقیقت میں جتنی خوب صورت ہیں، فلم میں اس کا نصف بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اپنی کمپنی کی کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں آگئی ہیں اور خصوصاً میری تو ...." اس کی زبان رک گئی۔ اس نے

سندری کی طرف دیکھا۔ سندری کے چہرہ پر کسی تاثر کا نشان نہ تھا۔ مینجر شرمندہ سا ہوگیا۔

" آپ رک کیوں گئے؟ کچھ بول رہے تھے نا۔" سندری نے غایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

" شاید آپ میری باتوں سے ناراض ہو جائیں۔؟"

" آپ بولئے بھی تو۔" سندری نے جیسے چڑھ کر جواب دیا۔

" میں آپ کو تصویر میں دیکھ کر آپ کا بن گیا تھا اور اس روز سے آرزو مند تھا کہ اپنی محبت کے اثر سے آپ کو اپنا بنا لوں۔ اندرا دیوی میں اپنا سب کچھ آپ پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔" مینجر نے جذبہ سے متاثر لہجہ میں کہا۔

سندری کا چہرہ اب تک بے اثر تھا۔ جیسے اس نے پوری بات سنی ہی نہ ہو۔

" اندرا دیوی کیا آپ میری درخواست قبول کریں گی۔" مینجر نے سندری پر ملتجیانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

سندری خموش رہی۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ مینجر نے وارفتگی کے عالم میں اپنی کرسی سندری کے نزدیک سرکائی۔ سندری نے اپنے جسم کو ایک طرف جھکا کر اضطراری طور پر اپنا عریاں مونڈھا مینجر کے قریب کر دیا۔

" اندرا دیوی آپ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟" مینجر نے چینی سے سوال کیا۔

سندری پھر بھی خموش رہی۔ اس کے چہرہ سے مظلومی اور لاچاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ استاد کی ناگزیر تادیب کا منتظر ہو۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور اُس کے سانس کی رفتار مدھم ہو رہی تھی۔ سندری کی اس کیفیت پر مینجر کو سخت تعجب ہو رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ سندری جو اسٹیج پر بجلی کی طرح کوندتی ہوتی ہے اس کی درخواست کا جواب ایک فردوسی اور رومان پرور انداز میں

دے گی۔ اسے ڈر ہونے لگا کہ شاید اس کی گفتگو سندری کو ناگوار گذر رہی تھی۔ لیکن وہ شوق و جذبہ سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ہمت کر کے سندری کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

"اندرا دیوی" اس نے جذبات سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

سندری نے اس کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ اس کی نگاہیں خشم گیں معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی مجبور کو اپنی بے بسی پر غصہ آجائے۔ منیجر گھبرا سا گیا۔ سندری اس کی طرف دیکھتی رہی جیسے وہ منیجر کی جانب سے کسی اقدام کی منتظر ہو۔ لیکن منیجر کی نگاہیں اس کی نظروں سے دوچار ہونے کی تاب نہ لا سکیں۔ اور اس کی پلکیں اضطراری طور پر جھک گئیں۔ سندری کی انگلیاں اکبارگی منیجر کے کلّے پر بجیں۔ منیجر طمانچہ کھا کر اور حیران ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سندری سے ایسے برتاؤ کی اُسے کبھی بھی توقع نہ تھی۔ وہ سہم گیا۔ اور نظریں نیچی کئے رکتے رکتے بولا۔

اندرا دیوی مجھے معاف کیجئے۔ مجھے بڑی غلط فہمی ہوئی۔"

اس کے چہرہ سے ندامت اور پشیمانی ظاہر ہو رہی تھی۔ سندری بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کرسی سے اُٹھ گئی۔ اس نے ٹیبل کلاتھ کا کونہ زور سے اپنی طرف کھینچا۔ ٹیبل پر رکھی ہوئی پلیٹیں زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ سندری غصّہ سے ہانپ رہی تھی۔ منیجر سہما ہوا کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سندری نے پھر اس کی طرف نگاہیں کیں۔ ان میں غصہ کے ساتھ التجا بھی شامل تھی۔ منیجر کچھ سمجھ نہ سکا اور مبہوت سا کرسی پر بیٹھا رہا۔ سندری کرسیوں سے ٹکراتی غضب ناک طور پر قدم بڑھاتی ہوئی منیجر کے مکان سے نکل آئی۔

(معاصر) ۱۹۴۳

●

باغی

حامد چھٹیوں میں گھر لوٹا تو اسے گھر کا نقشہ ہی دوسرا دکھائی دیا۔ چچا کی موت کے بعد اس کا چچیرا بھائی ذاکر نشۂ امروز کی سرشاری میں اندیشۂ فردا سے بے نیاز ہو کر لاابالی پن اور عیش پسندی کی زندگی گذارنے لگا تھا۔ جب دیکھئے باہر بیٹھک میں یاران میکدہ کی جمگھٹ رہتی، نائے و نوش کی محفلیں گرم ہوتیں۔ تاڑی کی ملگجی لبنیوں کے درمیان اکثر ٹھرّے کی کالی کالی بوتلیں گردنیں نکالے دکھائی دیتیں۔ جیسے ہرے بھرے سرسبز کھیتوں کی وسعتوں میں ٹکریوں کی نوکیلی چمنیاں دور سے نظر آتی ہوں۔ گاؤں کی کنواریوں سے خواب کی دنیا آباد کی جاتی۔ ان کی گٹھیلی بانہیں اور کسے کسے سینوں کے گنگنا دینے والے تذکرے تاڑی کی ترش گھونٹوں میں حلاوت پیدا کرتے ہوتے۔ کنواریوں کو بس میں لانے کی تدبیروں پر غور کیا جاتا۔ ساری محفل پر

سنجیدگی طاری ہو جاتی ۔ تجویزیں پیش ہوتیں ، ان پر بحثیں کی جاتیں جیسے پارلیمنٹ میں ایشیائی مقبوضات کے مسئلہ پر غور کیا جارہا ہو ۔ مالی دشواریاں منظور کردہ تجویز پر عمل درآمد کرنے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگتیں ۔ " بدمعاشوں کی مدد کے بغیر یہ کام بن نہیں سکتا ۔ وہ سالے تو روپیہ کی صورت دیکھے بغیر ہتھے نہیں چڑھتے ۔" ساری نظریں ذاکر کو بھانپنے لگتیں ۔ ذاکر نادرشاہانہ انداز میں گردن کو جنبش دیتا ہوا کہتا ۔ " خرچ کی فکر نہ کرو ۔ روپیہ تو میں دوں گا ۔" دوستوں کے شکستہ چہروں پر اطمینان کی جھلک پیدا ہو جاتی ۔ ذاکر کی پیٹھ ٹھونکی جاتی اس کی سخاوت اور دریادلی کی قصیدہ خوانی شروع ہو جاتی ۔ محفل میں پھر گرمی پیدا ہو جاتی اور مٹی کے آبخورے تاڑی کی بنیتوں کے منہ چومنے لگتے ۔

حامد یہ کیفیت دیکھ کر سناٹے میں آ گیا ۔ چچا کے رہتے بھی ذاکر کے کرتوت کچھ اچھے نہ تھے ۔ لیکن اس وقت اس کے مشاغل رندانہ کا میدان گھر سے باہر ہوا کرتا ۔ اب تو گھر کیا تھا ایک مستقل بھٹی خانہ جہاں جوار بھر کے بے فکرے امنڈتے رہتے ذاکر کی بیوی میاں کی بے اعتنائیوں سے عاجز آ کر میکہ میں جا رہی تھی اور گھر میں حامد کی بہن راشدہ اپنے امڈے ہوئے شباب کی تنہا محافظ بن کر رہ گئی تھی ۔ حامد خطرہ کے احساس سے سہم گیا ۔ اس نے ذاکر کو راہ پر لانے کی بہت کوششیں کیں لیکن ذاکر بھلا اُسے آنکھ کب لگاتا تھا کہ اس کی باتوں پر کان دھرتا ۔ وہ اپنے اوپر کوئی اعتراض برداشت نہ کرسکتا تھا ۔ آخر حامد نے فیصلہ کر لیا کہ جائداد کا بٹوارہ کر لے کے بھائی سے الگ ہو جائے اور بہن کو اس زہریلی فضا سے دور کر دے ۔ اس نے ایک دن ڈرتے ڈرتے ذاکر سے یہ بات کہی تو ذاکر کے جواب نے اس کے حواس گم کر دئیے ۔ وہ تو بالکل کنگال تھا ۔ مفلس ! اس کے باپ کے بعد سے اس کا چچا جائداد کی دیکھ بھال کرتا تھا ۔ اس کی معاملہ پردازی اور چال پھانس سے سارا علاقہ پناہ مانگتا تھا ۔ حامد کے باپ نے اپنی جائداد کے اوپر کچھ قرض چھوڑا تھا ۔ حامد کے چچا نے اس کے حصہ کی ساری

جائداد نیلام کرا کے اپنے نام سے منتقل کرالی تھی۔ حامد کو اس کی کوئی خبر نہ ہونے پائی تھی۔ "وہ ذاکر سے مقدمہ کر سکتا تھا" اس نے سوچا لیکن اس کے لئے روپے درکار تھے۔ "وہ مقدمہ کا خرچ کہاں سے لائے گا؟" اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ذاکر کے ساتھ عدالت بھی اس کے خلاف سازش میں شریک تھی۔ عدالت کی بنیادیں ہلا دینے کا جذبہ اس کے اندر اُبھر آیا لیکن اپنی کمزوری کے احساس نے اسے سپر ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

چچا اپنی زندگی میں اس کی تعلیم کا پورا خرچ دے رہا تھا۔ لیکن اس دفعہ ذاکر نے خرچ دینے سے انکار کر دیا۔

"مجھ سے تمہاری پڑھائی کا خرچ نہیں چلتا۔ پڑھائی وڑھائی چھوڑ کر کہیں کوئی دھندھا ڈھونڈھو۔ رہی رشیدہ وہ میرے ساتھ رہے گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔" ذاکر نے جائداد کا حال بتاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرہ کی سنجیدگی کی تہہ میں پوشیدہ رذیل جذبات حامد کو نظر آنے لگے۔

"لیکن وہ اکیلے اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟" اس نے سوال کیا۔ اس کے تیور سے بے اعتمادی ظاہر ہو رہی تھی۔

"جیسے اب تک رہتی آئی ہے۔" ذاکر نے تیکھے ہو کر جواب دیا۔ "اب کیا جوان ہو جانے سے اس کے پیچھے چور ڈاکو لگ جائیں گے۔" اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ حامد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے سامنے کے ٹوٹے ہوئے دانت سے گندہ رو عیں جھانکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

حامد بہن کی توہین پر تلملا گیا۔ جیسے ذاکر اس کی موجودگی میں اس کی بہن کے شباب پر چھاپا مارنا چاہ رہا ہو۔ اس کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور اس کے خوبصورت چہرہ پر تناؤ پیدا ہو گیا۔

"اگر میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا تو رشیدہ بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔" اس نے

رکتے رکتے کہا۔

"کہاں لے جاؤ گے اس کو۔ کلکتہ میں بہو بازار کی زینت بناؤ گے۔" ذاکر نے غصہ کے ساتھ لیکن تمسخرانہ انداز میں کہا۔

حامد آپے سے باہر ہوگیا۔ اس کا چہرہ غصہ سے گلابی ہوگیا۔ اس کے بھرپور فولادی بازوؤں میں کساؤ آگیا۔ اس کا سینہ تن گیا۔ جیسے وہ ذاکر سے خطرناک انتقام لینے والا ہو۔ لیکن اس کے اعضاء آپ ہی آپ ایکبارگی ڈھیلے ہوگئے۔ اس کے چہرہ کی سُرخی غائب ہوگئی اور اس کی نظریں جھک گئیں۔

حامد بہن کو لے کر اسی رات گاؤں سے نکل آیا اور چور کی طرح چھپتا چھپاتا اسٹیشن پہنچا۔ اس کے پاس ٹکٹ کے پیسے تو تھے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ٹکٹ لے تو کہاں کا۔ اسے ساری دنیا دشمن دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی مفرور مجرم جس کے پیچھے گرفتاری کا وارنٹ گھوم رہا ہو۔ اس کی ہمت پست ہونے لگی۔ اپنے سامنے اسے ایک مہیب سمندر لہریں مارتا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے کسی تباہ شدہ جہاز کے مسافر اپنے چاروں طرف گھڑیالوں کے جھرمٹ دیکھنے لگتے ہوں۔ وہ گھر واپس جانے کو سوچنے لگا۔ بھائی سے رحم کا خواستگار ہونے، اس کے آگے گڑگڑانے اور التجا کرنے۔ لیکن وہ بھائی کی طرف سے قطعاً ناامید ہوچکا تھا۔ اس سے کوئی درخواست کرنی اسے بے سود معلوم ہونے لگی۔ اسے فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ وہ گھر واپس نہ جائے گا۔ اور دماغ پر زیادہ زور دے کر آئندہ کی فکر کرنے لگا۔ اسے خیال ہوا کہ وہ مونگیر جا سکتا تھا۔ وہاں اس کا قابل اعتماد دوست منظر رہتا تھا۔ رشیدہ کو اس کے گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ اس وقت تک جب تک وہ ملازمت حاصل کرکے اپنے طور پر رہنے کے قابل نہ ہوجائے۔

حامد نے مونگیر کا ٹکٹ لیا اور بہن کے ساتھ گاڑی کے ڈبہ میں داخل ہوگیا۔ بہن کو ساتھ بٹھانے میں اسے کافی پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن وہ رشیدہ کو اکیلے

زنانہ خانہ میں چھوڑنے کی ہمت نہ کرسکا۔ رشیدہ نے پہلی بار تو ہی ریل کا سفر کیا تھا۔
رشیدہ چہرہ پر گھونگھٹ ڈالے سمٹی سمٹائی ایک کونہ میں بیٹھ گئی۔ حامد اس کے
پاس ہی بیٹھا۔ مردانہ خانہ میں یونہی گھونگھٹ والی عورت کم نظر آتی ہے۔ مسافروں
کی نظر خواہ مخواہ رشیدہ کی طرف جم گئی۔ ایک سیٹ پر چند نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ مسکرا
مسکرا کر آپس میں باتیں کرنے جاتے اور تھوڑی تھوڑی دیر پر رشیدہ کی طرف نظر ڈال
لیتے۔ حامد ان کی ڈھٹائی پر غصہ سے بھوت ہو رہا تھا۔ "ان کمینوں کی جیسے ماں بہن
نہیں۔" وہ دل ہی دل میں انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ
ایک ایک کو اٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دے۔ اس کے مضبوط پٹھے اسے آمادۂ تکرار
کرنے کو مچل رہے تھے۔ لیکن انجام کا خوف اس کے ارادہ پر قابو پا رہا تھا اور وہ خموش
بیٹھا رہا۔

"یہ آپ کی زنانہ ہیں؟" ایک ادھیڑ عمر کے مسافر نے نہایت متانت سے
سوال کیا۔ حامد کو جیسے مرچیں لگ گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مسافر اس کا مذاق
اڑا رہا ہو۔ یا اسے گالیاں دے رہا ہو۔ اس کا ارادہ ہو رہا تھا کہ وہ اٹھ کر مسافر
کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ لگائے کہ اس کے جبڑے حلق سے جا ملیں۔ لیکن مسافر کی ظاہرا
سنجیدگی سے وہ مرعوب سا ہو گیا۔

"بہن۔" اس نے کھڑکی کی طرف منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

مونگیر پہنچ کر حامد کچھ دن ملازمت کی فکر میں مارا پھرا۔ منظر کے گھر
زیادہ دنوں تک ٹک جانا اسے بے حد ناگوار تھا۔
منظر مونگیر کے ایک بارسوخ گھرانے سے لگاؤ رکھتا تھا۔ اس کی کوشش
سے حامد کو سگریٹ فیکٹری میں جگہ مل گئی۔ اور حامد کرایہ کے مکان میں اٹھ آنے
کو سوچنے لگا۔ لیکن مکان والے پیشگی کرایہ مانگتے تھے۔ اور حامد کے پاس
پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ پھر بلا تنخواہ ملے دال روٹی کا خرچ بھی کیونکر چل سکتا تھا۔

ادھر منظر کا بھی شدید اصرار تھا کہ حامد کرایہ کے مکان میں نہ جائے۔

"تم تو دن بھر فیکٹری میں کام کرتے رہو گے۔ رشیدہ اکیلی گھر میں بند کیا کرتی رہے گی؟ اس کی صحت کیوں خواہ مخواہ کو بگاڑنے کی فکر کر رہے ہو؟ اور بھئی یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔ رشیدہ کیا میری بہن نہیں ہے؟" منظر کے خلوص کے آگے حامد کو خاموش رہ جانا پڑا۔

ایک شام جب حامد فیکٹری سے لوٹ کر بہن سے ملا تو وہ اسے بہت مغموم معلوم ہوئی۔ اداس تو وہ یوں بھی برابر ہی رہتی تھی۔ لیکن اس روز اس کا چہرہ کھلایا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھیں سوجی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو۔ حامد اسے دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔ اور اس نے مضطربانہ سوال کیا۔ "کیوں؟ خیر تو ہے۔ آج اتنی سست کیوں ہو رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بھیا۔" رشیدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حامد انہیں دیکھ کر تڑپ گیا۔ جیسے اس کے دل میں چھید پڑنے لگا ہو۔

"تو پھر رو کیوں رہی ہو۔ بولو نا! طبیعت تو اچھی ہے؟ سر میں درد ہے؟" اس نے گھبراتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے دل کی الجھن اس کی بے چین نگاہوں اور پیشانی کی شکنوں سے جھانک رہی تھی۔ رشیدہ آنسو بہاتی رہی۔ اس کے لبوں پر سلوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہو لیکن بول نہ سکتی ہو۔

"رشیدہ تمہیں ہو گیا گیا ہے؟ بولتیں کیوں نہیں؟"

"بھیا .... کرایہ کا مکان لے لیجئے۔" رشیدہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ دیکھو تو منظر کو ہمارا کتنا خیال ہے؟ میں کب یہاں سے اٹھ گیا ہوتا لیکن اس کے اخلاق نے ہمیں روک رکھا ہے۔"

"وہ تو سدا ہمیں اپنے مکان میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔" رشیدہ پھر رونے لگی اس کے شرمائے ہوئے گلابی گال پر آنسو کی دھاریں پھوٹتی ہوئی شفق پر سورج کی

کرنوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"یعنی؟" حامد نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے سوال کیا۔ جیسے وہ رشیدہ کے دل کا سارا بھید آنکھوں کی راہ ایکبارگی پی لینا چاہتا ہو۔

"وہ مجھ سے خراب قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" رشیدہ نے سر جھکائے ہچکیوں کے درمیان کہا

حامد کو جیسے کسی نے ساری باتیں سمجھا دیں۔ اس کے قیام پر منظر کا اصرار اور رشیدہ کے ساتھ اس کی غیر معمولی ہمدردی اس کے دماغ پر ایک نئے مفہوم کے ڈھانچہ میں ابھرنے لگی۔ اس کے جی میں آیا کہ اسی وقت جا کر منظر کو اس کے کمینہ پن کا مزہ چکھائے۔ وہ اس کی گھسی گھسی گول آنکھوں میں اپنی نوکیلی خمدار انگلیاں گھونپ دینے کا ارادہ کرنے لگا! اپنے آہنی پنجہ سے اس کی گردن کی رگیں مروڑ دینے کا۔ اس کی زبان کو اپنی آہنی چٹکیوں سے مسل کر بیکار کر دینے کا! تاکہ وہ آئندہ اس کے گندہ جذبات کی ترجمانی نہ کر سکے۔ لیکن بہت جلد اس کے منصوبے ڈھیلے ہو گئے۔ جیسے کسی نے ایک بھیانک انجام کا منظر دکھا کر اسے خوف زدہ کر دیا ہو۔

حامد اسی رات کو رشیدہ کے ہمراہ چوری چھپے مونگیر سے پٹنہ چلا آیا۔ سگریٹ فیکٹری سے اسے دو دن پہلے تنخواہ کے روپے مل چکے تھے۔ پٹنہ میں اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور پھر ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔

تھوڑی دوڑ دھوپ کے بعد حامد کو مترا اینڈ سنز کے موٹر ورکشاپ میں ملازمت مل گئی۔ اس کے مضبوط بازو اور سڈول جسم نے اس کی سفارش کی۔ تنخواہ گو قلیل تھی لیکن گذارہ کے لئے کافی۔

مسٹر مترا کے کارخانہ میں موٹروں کی مرمت کے علاوہ موٹروں کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ کارخانہ کو کافی فروغ تھا۔ اچھی تعداد میں مختلف عہدوں پر ملازمین متقرر تھے۔ کارخانہ کی دیکھ بھال مسٹر مترا خود کرتے تھے۔ دن میں ایک بار کارخانہ ضرور آتے۔ اکثر ان کے ساتھ موٹر پر مسز مترا بھی آتیں۔ اور کبھی انہیں چھوڑ کر خود موٹر

لے کر واپس ہو جاتیں اور کبھی شوہر کے ساتھ کارخانہ کے اندر بھی آجاتیں۔ اکثر ورکشاپ کی زیارت بھی کر لیتیں۔ یہ مسٹر مترا کی دوسری بیوی تھیں۔ مسٹر مترا سن میں ساٹھ سے تجاوز کر چکے تھے اور یہ تیس کے لگ بھگ تھیں۔ بنگالی عورتوں کا شباب تیس کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتا۔ مسز مترا کی جوانی بھی ان کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ لیکن جوانی کے لٹتے ہوئے چمن میں مصنوعی گلکاری کی سج دھج سے دائمی دلکشی پیدا کرنا توان کے بس کی بات تھی۔ چہرہ کی بے رونقی پر نقاب ڈالنے کے لئے لپ سٹک اور چیک پروف کی کمک کافی تھی۔ اعضا کا تناؤ اے۔ ڈی۔ پال کے سلے ہوئے بلوز اور سٹو فکس کے تمبو سے علیٰ حالہٖ قائم رکھا جا سکتا تھا۔ رہ گئے جوانی کے انداز اور کرشمہ سازیاں۔ یہ چیزیں تو اپنے قابو کی ٹھہریں۔ آنکھوں میں گردش اور کمر میں لوچ تو ہر سن میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اکثر بوڑھی عورتوں کی ادائیں کمسن دوشیزاؤں پر بازی لے جاتی ہیں اور مسز مترا تو ابھی بوڑھی ہرگز نہ تھیں۔

حامد ایک دن کام میں مصروف تھا کہ مسز مترا اس کے پاس آکر ٹھہر گئیں۔ ان کی موجودگی کا اسے دفعتاً احساس ہوا اور وہ ان کے مقابل سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ مسز مترا اس کے چھریرے بدن اور خوب صورت چہرہ پر للچائی سی نظریں جمائے کھڑی تھیں۔ حامد اس احساس سے شرما کر مسز مترا کی نگاہوں میں زیادہ حسین دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر بعد مسز مترا وہاں سے چلی گئیں۔ بغل کے کام کرنے والوں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ حامد کی طرف دیکھا۔

"حامد صاحب! اب کیا ہے۔ آپ نظریں گڑ گیا ہے۔" براؤن نے بائیں آنکھ دابتے ہوئے کہا۔

"کوٹھی پر بلاہٹ ہو گی"۔ مکرجی نے گردن میں جنبش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ حامد ان کی گفتگو کا مطلب سمجھے بغیر جھینپ گیا۔

مسز مترا دوسرے دن پھر تشریف لائیں۔ اور حامد کے قریب آکر رک گئیں۔

آپ ہم کو فرم میں کب سے کام کرنا ہے ؟" مسز مترا نے اپنے نازک لبوں سے گل افشانی کی۔

"ایک مہینہ سے زیادہ ہوا۔" حامد نے نظریں نیچی کیے جواب دیا۔

"آپ موٹر چلانے سکتا ہے ؟" مسز مترا نے اپنی نیم باز آنکھوں میں گردش پیدا کرتے ہوئے سوال کیا۔

"تھوڑا سیکھا ہے اور مشق کی ضرورت ہے۔" حامد نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا ہم صاحب سے آپ کو ڈرائیوری کا کام پر لگا دینے کو بولیں گے ــــ ٹھیک ہے نا ؟ جب صاحب ساتھ میں نہیں ہوتا ہے تو ہم کو ڈرائیور کا درکار ہوتا ہے۔ ایسے تو ہم اپنا بھی ڈرائیو کر لیتے ہیں۔" مسز مترا نے آنکھوں کو ساحرانہ جنبش دیتے ہوئے گردن میں ایک خم پیدا کیا اور کمر کو لوچ دیتی ہوئی تیز قدم سے ورکشاپ سے نکل آئیں۔ جیسے کوئی نازک سی کشتی ہوا کے رُخ پر چل رہی ہو۔

" دوسرے دن مسٹر مترا نے حامد کو اپنے آفس میں بلوا بھیجا۔

"آج سے تم ڈرائیوری کا کام سیکھنا شروع کر دو۔ سمجھے ؟ میم صاحب تم کو اپنے ساتھ رکھنے بولتی ہیں۔ تمہارا طلب بھی دس روپیہ بڑھا دیا جائے گا۔"

" حامد اظہار شکریہ نہ کر سکا جیسے اپنی اس ترقی پر اسے کوئی خوشی نہ ہوئی ہو۔

حامد کی نئی تقرری پر ورکشاپ میں کافی چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔

"ڈبل بارا یار ! تنخواہ بھی بڑھا۔ مجا بھی ماریں گے۔" مکرجی نے رشک سے کہا۔

" مزا۔ ہونہہ۔ ارے اس میں اب دھرا ہی کیا ہے۔ چُس جائے گا غریب دیکھ لینا ایک مہینہ بعد ہڈی ہڈی نہ نکل آئے تو میرا نام نہیں۔" مکارم بولا۔

" تم نہیں جانتا۔ ابھی تم دنیا کیا دیکھا ہے۔ دو من جب بوڑھا ہوتا ہے ہمارا مینگ ہے جب ایج والا ہوتا ہے تب اس کا ٹیسٹ بھی اور ہے۔ گڈ لک

حامد بھائی۔!" براؤن نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

حامد حیرت سے ان سب کا منہ تک رہا تھا۔ ان کی باتیں پوری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔

حامد ڈرائیوری کی مہارت حاصل کر کے مسز مترا کو سلام کرنے کوٹھی پر پہنچا۔ مسز مترا نے اسے ڈرائنگ روم میں بلوا بھیجا اور کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حامد کو جرأت نہ ہوئی۔

"بیٹھئے۔" اس نے لوچدار آواز میں مسکراتے ہوئے لیکن تحکمانہ کہا۔

حامد نے تعمیل حکم کی اور مؤدب ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

مسز مترا گھر میں نہ تھے۔ کوٹھی بالکل سناٹی تھی۔ نوکر وغیرہ آؤٹ ہوس میں تھے۔

مسز مترا مشتاقانہ نظریں حامد پر جمائے ہوئے تھیں۔ حامد کو پسینہ چھوٹنے لگا مسز مترا اس کے قریب ہو گئیں۔ اور اپنے ریشمی رومال سے دل ربایانہ انداز میں اس کا پسینہ پونچھنے لگیں۔ ان کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ حامد کے کان اس کی آمد و رفت سن رہے تھے۔ پسینہ پونچھتے وقت اس نے مسز مترا کی گرم گرم انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ ان کی حریص آنکھوں سے جنسی خواہشات کا سوتہ پھوٹ رہا تھا۔ حامد یکبارگی اُٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے وہ دفعتاً ڈر کر چونک گیا ہو۔ مسز مترا نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا اور اس کی انگلیاں اپنی انگلیوں میں اُلجھا کر اس سے کھیلنے لگیں۔ حامد کو ہراس و تعجب نے جیسے بے جان کھلونا بنا دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن اس کے دماغ پر بادل چھا گئے تھے۔ فہم و ارادہ دونوں صلاحیتیں دفعتاً مفلوج سی ہو گئی تھیں۔

"تم کتنے پیارے ہو! کتنے خوب صورت!" مسز مترا کے منہ سے پھر پھول جھڑنے لگے۔ شدت جذبات نے لپ سٹک کی لالی اور گہری کر دی تھی۔ جیسے

لبوں میں تازہ خون لگا ہوا ہو۔

"مسز مترا آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟" حامد کے حواس مجتمع ہو گئے اور پھر کرسی سے اٹھ گیا۔

" دیکھو پیارے جانے کا کوشش مت کرو۔ ہم تم سے کچھ نہیں چاہتے۔ بس تمہارا پیار۔ اس کو لئے ہم ہر دام دینے کو تیار ہیں۔ روپیہ، پوزیشن، تم کو جو بھی چاہئے۔" مسز مترا مجسم التجا بنی آرزومندانہ نگاہوں سے حامد کو تکنے لگی۔

"مسز مترا!" حامد نے جیسے مسز مترا کو جگانے کی کوشش کی۔

"ڈیر، گھبراؤ نہیں۔ کوئی جانے گا نہیں۔"

" میں یہ باتیں نہیں کر سکتا۔" حامد نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

" دیکھو ایسا بات نہ بولو۔" مسز مترا نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔

" مجھے جانے دیجئے۔"

" ہم جو بولتے ہیں ان لو۔"

" یہ ناممکن ہے۔" حامد اپنے اندر ایک زبردست قوت محسوس کر رہا تھا۔ مسز مترا کی دولت اور نام ونمود سے بھی زیادہ عظیم الشان۔

مسز مترا نے حامد کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ حامد نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

" ایہہ ......" مسز مترا نے ایک لمبی چیخ ماری۔

کوٹھی کے نوکر اور مالی دوڑ پڑے۔ حامد گھبرا کر دم بخود سا ہو گیا۔

" اس بدمعاش کو نکالو، ہم کو عزت کھراب کرنا چاہتا ہے۔"

حامد نے سوچا کہ ان سب کو مار مار کر ادھموا کر دے۔ اسے اپنے بازو پر کافی بھروسہ تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جاپانی کھلونے کی طرح سب سے پہلے مسز مترا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور مالیوں اور نوکروں کو اپنے فولادی پنجہ سے زیر کر کے بھاگ نکلے۔ اس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ایک نوکر کا ہاتھ اپنی

اپنی آہنی گرفت میں لے کر مروڑنا شروع کیا اور دوسرے کی گردن کی جانب اپنا دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی۔ جیسے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگ گئی ہو اور جیل کے دروازے اس کے سامنے کھول دئے گئے ہوں۔ اس نے بلا چون وچرا اپنے آپ کو نوکروں کے حوالہ کردیا اور انہوں نے دھکے دے کر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔

حامد اپنی تضحیک کا زخم سینے میں چھپائے گھر لوٹ آیا۔

رشیدہ اس طرف پندرہ بیس دنوں سے میعادی تپ میں مبتلا ہوگئی تھی۔ گو بخار اُتر گیا تھا اور وہ صحت حاصل کر رہی تھی لیکن ابھی تک اسے ضعف باقی تھا اور قوت کی دوا اور اچھی غذا کی اسے سخت ضرورت تھی۔ تنخواہ کے سارے روپیے رشیدہ کے علاج پر ختم ہوچکے تھے۔ بلکہ دوا کے کچھ پیسے دینے باقی تھے۔ تنخواہ دوسرے دن ملنے والی تھی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد مسٹر مترا کے ورکشاپ سے تنخواہ ملنی تو کجا وہاں قدم رکھنا بھی حامد کے لئے محال ہوگیا تھا۔

حامد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ جیسے مسلسل ناکامیوں کی آندھی نے اُمید کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو یکلخت بجھا دیا تھا۔ رات بھر اسے ایک لمحہ نیند نہ آئی۔ وہ عجیب بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ ایک مسلسل اضطراب کی کش مکش۔ کبھی وہ مکان سے نکل کر گلی کی ایک نکڑ سے دوسرے نکڑ تک جا کر لوٹ آتا۔ ایک والہانہ انداز میں جیسے اس کے پاؤں آپ ہی آپ چل رہے ہوں کبھی اس کے پاؤں سرد ہو کر ایک جگہ جم جاتے جیسے ان کی حرکت سلب کرلی گئی ہو یا وہ سوکھ کر کرٹے ہوگئے ہوں۔ وہ دانتوں میں انگلی دبائے آنکھیں پھاڑے کھڑا ہوجاتا جیسے اس کے شعور پر حیرت کا جمود طاری ہوگیا ہو۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات پے درپے چکر لگا رہے تھے۔ اکثر بے ربط اور الجھے الجھے خیالات کی رَو اتنی تیز ہوجاتی کہ اس کا شعور ان کے بہاؤ میں گم ہوجاتا جیسے

سینما کی مشین دفعتاً غیر معمولی سرعت سے چلنے لگی ہو اور تصویریں ایک دوسرے میں مل کر گڈمڈ ہو رہی ہوں۔ کبھی خیالات کی رفتار میں یکلخت ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا۔ وہ یکدم خالی الذہن ہو جاتا جیسے کسی ناگہانی حادثہ سے سکتہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔

حامد بستر پر آ کر گر گیا۔ اس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اور اس کے چہرہ پر خشونت کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ "مذہب! اخلاق! قانون! شرم! حیا! یہ سب آدمی کا خون پینے کے ہتھکنڈے ہیں۔" وہ یکایک بڑبڑانے لگا۔ "ان سب کا قلع قمع کر دینا چاہیے انہیں توڑ پھوڑ کر نیست و نابود کر دو۔ چور! ڈاکو! بدمعاش! زانی۔ آدمی کو پیس کر خاک کر دینے کے بہانے۔ شرافت! کون شریف ہے؟ سب کمینے ہیں۔ عزت! شرافت سب خالط! سب فریب! اپنی گردن میں پھانسی ڈالنے کا پھندا۔" اس کے چہرہ سے دحشت ٹپک رہی تھی۔ جیسے یہ الفاظ آپ ہی آپ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

وہ یکبارگی دانت پیستا ہوا بستر سے اُٹھا۔ اس کے سر کے بال کھڑے ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ اور ان سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ پلکیں جامد ہو گئی تھیں۔ اور آنکھوں کا ڈھیلا جیسے جم کر پتھر ہو گیا تھا۔

اس نے راشدہ کے پلنگ پر ایک جست لگائی اور اسے اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔

"بھیّا!" راشدہ کے منہ سے ایک جگر خراش چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

حامد ایک خونخوار بھیڑیے کی طرح اس کے لب چوسنے لگا۔

(معاصر) ۱۹۴۳

ماں

ماں کی اچانک موت نے اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔ نہ جانے اس کے قلب میں یک بیک کیا روگ ہو گیا تھا۔ چند گھنٹے تو وہ بیمار رہی وہ اچھی طرح علاج نہ کرا سکا۔

ماں کے سوا دنیا میں اس کا کون تھا۔ باپ اسے ماں کے پاس چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ اپنی تنہا تنہائی جب رہی تو ماں اسے اس قدر چاہتی تھی۔ ایک لمحہ کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اس کی پڑھائی بھی اسی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔ محلہ والوں سے اس کی ملاقات بس یا ہر یا ہر سے تھی جب ماں زندہ تھی اسے کسی کی حاجت نہ ہوتی تھی۔

جب اس کا باپ مرا تو وہ ایک سال ہی کا تو تھا۔ باپ کے وجود کا اسے حس تک

نہ تھا۔ وہ صرف ماں ہی کو جانتا تھا۔ ماں ہی اس کی دنیا تھی۔ ماں نے اسے پروان چڑھایا تھا۔ لیکن اب ماں بھی چل بسی تھی۔ دنیا میں اسے تنہا چھوڑ کر۔

وہ گھر سے بیزار ہو گیا تھا۔ گھر کا چپّہ چپّہ اسے ماں کی یاد دلاتا رہتا۔ ایک دن خراش یاد جیسے اندھیری رات میں تند ہوا کی کراہ فضا میں لرزہ پیدا کر دیتی ہو۔ گھر اسے کاٹنے لگا تھا۔ اس نے اس کی ماں کو ہضم کر لیا تھا۔ اسی گھر کے اندر تو اس کی ماں آنکھیں موند کر کھو گئی تھی۔

وہ دن دن بھر گھر سے باہر، آبادی سے باہر سنسان میدانوں میں مارا مارا پھرتا لیکن ماں کی یاد ایک منٹ کے لئے اس سے الگ نہ ہوتی۔ بازار کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے سودا والوں کی چیخ پکار اور میدان میں آزاد ہواؤں کے شور سب کے اندر اسے ماں کی آواز سنائی دیتی جیسے یہ سب اس کی ماں کو نگل رہے ہوں اور اس کی کراہ فضا میں تڑپ رہی ہو۔ وہ اندھیری رات میں آنکھیں پھاڑے ندی کے پل پر پہروں بیٹھا رہتا جیسے کسی کا منتظر ہو یا کسی دور سے آنے والے کو تک رہا ہو۔ ندی کا سست رفتار پانی اپنی مدھم سروں میں اس کی ماں کی ہم نوائی کرتا ہوتا۔ مرغابیوں اور ربطوں کی آواز میں اسے اپنی ماں کی پکار سنائی دیتی۔ پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے چوکنّا کر دیتی۔ اسے ماں کی آہٹ سنائی دیتی۔

وہ شہر شہر گھومتا پھر رہا تھا۔ بنارس، لکھنو، الہ آباد، کان پور کہیں بھی اس کا جی نہ لگا تھا۔ تاج محل کی عالمگیر دل فریبی بھی اس کا غم نہ غلط کر سکی۔

وہ پرانی دلّی میں کھنڈروں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ دھنسے دھنسے مقبروں اور شکستہ حال مسجدوں کے گنبد کے نیچے وہ پہروں بیٹھا رہتا۔ ویسی ہی ایک قبر میں اس کی ماں بھی تو سما گئی تھی۔ قبروں کے شکم سے اس کی ماں کی روح اسے پکارتی سنائی دیتی۔ وہ محویت کے عالم میں ماں کی آواز پر کان لگا دیتا۔

یوں ہی مارا مارا پھرتا وہ نظام الدین اولیا کی طرف آ نکلا تھا۔ ایک شکستہ حال کھپریل سائبان کے سامنے لکڑی کے دو بنچ اور ٹین کی تین کرسیاں پڑی تھیں۔ بنچ پر دو بوڑھے بیٹھے ٹانگیں ہلا رہے تھے۔ ان کی خم دار پنڈلیاں ننگی تھیں اور کرتے کی جگہ میل کی کھردری تہہ نے لے رکھی تھی۔ پسلیوں کی ہڈیاں ابھرے ہوئے خطوط کی طرح پھیلتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی سے مل کر چک ڈیزائن بنا رہی تھیں۔ میل کے رنگ کے ڈھیلے پاجامے کمر سے لٹک کر زمین کی سطح پر پاؤں ہلاتے وقت جھاڑو پھیر رہے تھے۔ سائبان میں دیوار کے بکس پر تام چینی کی چپٹ اکھڑی چائے دانی چائے کی تین پیالیاں اور ایک چینی کا مرتبان رکھا تھا۔ چینی کی ملگجی سطح پر چیونٹوں کی لاشیں بے ترتیب ابھری ہوئی تھیں۔ پیٹ کی آگ نے انھیں بھی موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ برفانی میدانوں میں لڑنے والے سپاہی بھی اسی طرح برف کی سفید چادروں سے ہاتھ پاؤں نکالے الٹے سیدھے پڑے رہتے ہوں گے۔

دونوں نے اسے کن آنکھوں سے دیکھا اور پھر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"درگاہ شریف کی زیارت کو آئے ہو۔ کچھ کھاؤ گے بھی۔ ٹھنڈا گرم گوشت روٹی ہمارے یہاں ہر وقت تیار رہتا ہے۔" ایک بڈھے نے ذرا رعب ڈالتے ہوئے کہا آخر وہ ہوٹل کا مالک تھا۔

اس نے ایک گلاس شربت پیا اور درگاہ کے رستہ کا نشان لے کر آستانہ پر آ کر ٹھہر گیا۔ ماں سے اس نے حضرت نظام الدین اولیا کے کرامات کی بہتیری داستانیں سنی تھیں۔ وہ سب ایک ایک کر کے اس کے حافظہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت اس کے دماغ سے ماں کا خیال نکل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ جیسے کوئی سفر کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہو۔ اس کے دل میں عقیدت کی حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ درگاہ کے آستانہ پر ہی زندگی گذار دے۔

درگاہ کا مجاور آنکھوں پر ہاتھ رکھے درگاہ کے سائبان میں چت پڑا تھا۔ اس کا

سر نہ تو پورا گنجا تھا اور نہ پورے سر میں بال تھا بلکہ تھوڑی تھوڑی دور پر بال کی کھونٹیاں جمی ہوئی تھیں۔ جیسے ندی کے ریتیلے ساحل پر سرکنڈوں کی جھاڑیاں دور دور پر اُگ آتی ہیں۔ پائجامہ کی مہریاں اوپر تک اٹھی ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس کی سوکھی سوکھی ٹانگیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک ٹانگ گھٹنہ سے مڑی ہوئی سیدھی کھڑی تھی اور دوسری زاویہ بناتی ہوئی ایڑی کے سہارے پہلی کے گھٹنہ پر ٹکی ہوئی تھی جیسے کسی شکستہ قلعہ کا صدر دروازہ جس کے اوپر کا ستون بے قاعدگی سے نیچے کے کھمبوں کے سہارے پڑا ہوا ہو۔ شاید وہ اپنی خستہ حالی کا نشان بنائے ہوئے تھا۔ وہ اپنی تنگ حالی پر ہی تو غور کر رہا تھا "ڈیڑھ سیر کا چاول، ڈیڑھ روپیہ گز مارکین چھ بچے، ایک بیوی، گھر کی چھپر برسات کی پہلی جھڑی کی منتظر۔ جوان بیٹی بر کی تلاش، زمانہ کا رنگ۔ وہ سوچتا جاتا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر پر مکھیوں سے دق آکر ہاتھ کی گردش سے ایک نیم دائرہ بناتا جاتا۔" اتنے کھانے والے اور اس کی ایک ذات کے سہارے۔ اس پر لوگوں کی عقیدت مندی کو کچھ اس بری طرح گھن لگ رہا تھا کہ دو دو چار چار دن نہ کوئی زیارت کو آتا نہ منت مراد پوری کرنے" اسے وہ ملا یاد آگیا۔ اونچی مہریوں کا پائجامہ پہنے، لمبی داڑھی کو جنبش دیتا ہوا نذر و نیاز کے خلاف وعظ کہہ رہا تھا۔ "آواز کیسی بھدی تھی اس مردود کی جیسے برسات میں بینگ ٹرٹرا رہا ہو۔ ان وہابیوں سے خدا سمجھے۔ جانے انھیں بزرگان دین سے کون سی للہی عداوت چلی آتی ہے۔ کم بختوں نے ایسا جال پھیلا رکھا ہے کہ صوفیائے کرام کی رہی سہی وقعت نگاہوں سے گرتی جارہی ہے۔" بڈھے کے وعظ کا وہ حصہ نشتر کی طرح اس کے دماغ پر ابھرنے لگا۔ "ان خانقاہوں میں قبر پرستی ہوتی ہے۔ شرک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بدعتوں کا رواج بڑھتا ہے۔" "جیسے مذہب کی ٹھیکہ داری انھیں کے حوالے کی گئی ہے۔ قرآن حدیث طوطے کی طرح رٹ کر قابل بنے پھرتے ہیں۔ دنیا میں جیسے کوئی اور کام نہیں کہ بچہ جھاڑ کر ہم مجاوروں کی روزی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ آخر یہ دھندا نہ پیدا کرتے تو انھیں پوچھتا ہی

کون۔ پکڑ پکڑ کر کوٹھڑیوں میں انھیں بند کر دیا جائے، تب انھیں معلوم ہو کہ غریب مجاوروں کو بھی بھوک......

ایک مکھی اس کے چٹے ہوئے لبوں کے درمیان کی کھائی میں سیر کرتی ہوئی کھجلاہٹ پیدا کرنے لگی۔ جیسے ٹینک چلنے میں زمین کانپنے لگتی ہے۔ خیالات کی رو دفعتاً رک گئی۔ اور اس نے اپنے منہ پر چیٹ سے ایک طمانچہ لگایا۔ وہابیوں کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کے لئے کوئی سبیل تو ہونی ہی تھی۔

وہ درگاہ کی چوکھٹ سے لگا محویت کے عالم میں کھڑا تھا۔ مجاور کی نظر، جو ڈھاٹا اٹھانے کی وجہ سے آزاد ہو گئی تھی، اس پر پڑی۔ وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور للکار کر کہنے لگا "آئیے آئیے مولا کا دربار ہے۔ اندر داخل ہو جائیے۔ مزار شریف کی زیارت کیجئے۔ کچھ نذر چڑھائیے۔ میں الائچی دانوں کا انتظام کروں گا۔ یا جیسی آپ کی مرضی۔ اس دربار سے آج تک کوئی محروم نہیں گیا جو آیا منہ مانگی مراد پائی۔" مجاور نے اس کے قیافہ سے اس کی عقیدت کا جوش بھانپ لیا تھا۔ حضرت کے نام پر کچھ رقمیں اینٹھ لینے کی امید اس کے چہرے پر چمکنے لگی۔ ایسے ہی سادہ لوح عقیدت مندوں کی کمی کا تو وہ دکھڑا رو رہا تھا۔

وہ مجاور کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مجاور نے اسے قبروں کی تفصیلات بتائیں

وہ حضرت اولیا کی قبر کے پاس کھڑا ہو کر مشتاقانہ نگاہوں سے جالیوں کے سوراخ سے تاکنے لگا۔ جالیوں میں رنگا رنگ چیتھڑے بندھے تھے۔ لال۔ پیلے ہرے اور جانے کتنے رنگوں کے۔ رنگ رنگ کی آرزوئیں بھی تو ان سے لپٹی ہوئی تھیں۔ بلکتا بسورتا گھناؤنا لوتھڑا گود میں ڈھوئے پھرنے کی آرزو۔ دولت اور ہوسناکی کی قربانگاہ پر کمسن دوشیزاؤں کی بھینٹ قبول ہونے کی تمنا، بیواؤں کا مال ہڑپ کرنے کے لئے عدالتی کارروائیوں میں کامیابی کے ارمان۔ ایسی ہی کتنی تمنائیں تھیں جو اپنی تسکین کے لئے مضطرب مقبرہ کی فضا میں گڈمڈ ہو کر ایک انتشار سا پیدا کرتی رہتی ہوں گی۔ جیسے

کسی نئے کھیل کی آمد پر سینما میں تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خریدنے والے ۔ بعض پر حضرت اولیا کی نظر ہو جاتی ہو گی ۔ لیکن زیادہ تر مچل مچل کر جالیوں کی دیوار سے ٹکرا کر ہی تمام ہو جاتی ہوں گی اس بدنصیب ملک میں ان کراہتی دم توڑتی پامال آرزوؤں کی بہتات فضا کے ذرات سے بھی اوپر ہے ۔ آرزوؤں کے کھیت ہیں ، مزدوروں کی آرزوئیں ۔ کسانوں کی آرزوئیں ۔ یتیموں کی آرزوئیں ، بیواؤں کی آرزوئیں اور جس طرح جنگ کا عفریت ہری ہری فصلوں کو بیدردی سے روندتا ہوا نکل جاتا ہے اسی طرح یہ آرزوئیں بھی کچی جا کر پھولنے پھلنے سے پہلے مدفون ہوتی چلی جا رہی ہیں ۔

قبر پر تازہ پھولوں کی چادر چڑھی ہوئی تھی ۔ فضا ان کی شمیم سے معطر ہو رہی تھی ۔ پھولوں کی خوشبو اس کے دماغ میں رس کر ایک غیر معمولی بہجت اور سکر کی کیفیت پیدا کر رہی تھی ۔ جیسے وہ کسی ایسے فردوسی عالم میں پہنچا دیا گیا ہو جہاں حیات کی مکمل بیداری سوچ اور فکر کی پراگندگی کو بھٹکنے نہ دیتی ہو ۔ ایک وجدانی کیفیت کی سرشاری ۔

اسے اپنی داہنی جانب سے دفعتاً ایک آہٹ سنائی دی ۔ ایک سیاہ پوش عورت اس کے بازو سے لگی کھڑی تھی ۔ اس کے سر کے بال پشت پر لہرا رہے تھے ۔ اور اس کے سادہ لیکن نظر فریب چہرہ پر خلوص اور عقیدت کی چمک نمایاں تھی ۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو قندیلیں پھوٹ رہی تھیں ۔ سورج کی ایک بے باک کرن ان میں ہیرے کی چکاچوند پیدا کر رہی تھی ۔ وہ چھپکلی کی طرح جالی سے چمٹی ہوئی تھی ۔ اگر جالی اسے روک نہ دیتی تو شاید وہ قبر سے جا کر لپٹ جاتی ۔

وہ اس عورت کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق کی جھلک تھی ۔ جیسے کوئی بھولا بسرا سپنا دوبارہ تازہ ہو رہا ہو یا اسے کسی دوسرے عالم میں پہنچا دیا گیا ہو ۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی ہو رہی تھیں اور لب کھلے ہوئے تھے ۔ پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں ۔ اور چہرہ پر استعجاب نے ہلکا چمپئی رنگ بھر دیا تھا ۔ عورت کے چہرہ سے ایک روشنی دائرہ بناتی ہوئی فضا میں پھیلتی دکھائی دے رہی تھی ۔ وہ سب

کچھ بھول گیا تھا۔ ماں کا غم مقبرہ کی عظمت، اولیا کا تقدس۔

عورت تھوڑی دیر میں واپس جانے لگی۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جیسے کسی غیر محسوس دھاگہ سے اسے عورت کی ساری کے پلّو کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔

عورت درگاہ سے نکل کر تانگہ پر سوار ہوگئی وہ بھی ایک دوسرے خالی تانگہ پر بیٹھ کر عورت کے پیچھے لگ گیا۔

عورت کا تانگہ چاوڑی میں آکر رکا۔ اس نے بھی اپنا تانگہ روک دیا۔ عورت تانگہ سے اُتر کر سڑک کے کنارے ایک دکان کی بغل سے تنگ دروازہ میں داخل ہوگئی اور سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس نے اسے سیڑھیوں سے چڑھتے دیکھا۔ اور تانگہ چھوڑ کر وہاں سے واپس ہوگیا۔ نہ جانے تانگہ والے نے اسے پاگل سمجھا، یا اوباش۔

وہ چند قدم چل کر پھر دفعتاً عورت کے کوٹھے کی طرف بڑھ گیا اور نزدیک آکر کھڑا ہوگیا۔ جیسے یکبارگی اس کے پاؤں تھام لئے گئے ہوں۔ وہ دیر تک دروازہ سے لگا کھڑا رہا۔ سیڑھیوں کو آنکھیں پھاڑے تکتا ہوا۔ جیسے سمندر پار سے لوٹنے والا سپاہی ساحل کی بندرگاہ کو دور سے نظریں جمائے دیکھ رہا ہو۔ پھر اس کی ٹانگوں میں یکایک حرکت پیدا ہوگئی اور سیڑھیوں سے اوپر چڑھنے لگا۔

شاما بیٹھی اپنی زندگی کو سوچ رہی تھی۔ اس کے دن بگڑتے چلے جا رہے تھے مشکل سے کوئی بھولا بھٹکا گاہک اب آنکلتا تھا۔ روٹی چلنا دشوار تھا۔ ایک اندھی ماں اور دو یتیم بھانجوں کی پرورش۔ تہوار کو چند ہی دن تو رہ گئے تھے۔ دونوں بچے صبح شام قمیص اور جوتوں کے لئے اس کی جان کھائے ہوئے تھے "آخر وہ انھیں کب تک یوں بہلاوہ میں رکھ سکے گی۔" ماں کے طعنے الگ سننے پڑتے تھے کہ اسے پیشہ کا ڈھنگ نہیں آتا۔ کاش ماں کی آنکھیں ہوتیں اور وہ اس غبار کو دیکھ سکتی۔

جو اس کی گذرتی ہوئی جوانی اس کے چہرہ پر چھوڑتی جارہی تھی۔" مینا کون بڑی آنکھ ناک کی سُتھری ہے کہ جب دیکھو اس کے کوٹھے پر ٹھٹ لگا رہتا ہے۔ کوئی آدھا آپ اپنی تقدیر کے پیچھے لگ جائے تو اس کا کیا علاج۔" لیکن ماں بھول گئی تھی کہ مینا اس سے دس سال چھوٹی تھی۔ وہ ماں کو یہ بات تو کہہ بھی نہ سکتی تھی اپنی عمر کو سوچتے ہی اس کا سر چکرانے لگتا تھا۔ وہ اسے زبان تک کس طرح لاسکتی" ان بچوں کو وہ آج کس طرح ٹالے گی۔ آج تو وہ روپیہ لئے بغیر اس کی جان نہ چھوڑیں گے وہ انھیں دے گی کہاں سے۔ کیا پرب میں بھی انھیں نئے جوڑے نصیب نہ ہوں گے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک کر اس کی گود میں سما گئے۔ گھر کا بھاڑا بھی تو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ تین ماہ سے وہ ایک کوڑی نہ دے سکی تھی۔" اب نہ دے سکی تو شاید کوٹھا چھوڑنا پڑے۔ پھر ماں اور بچے کہاں رہیں گے۔ وہ خود کہاں رہے گی۔ کسی تنگ و تاریک گلی کے اندر۔ وہاں اس کا روزگار کیوں کر چلے گا۔ یہاں تو روٹی کا خرچ کسی طرح نکل آتا ہے۔ وہاں..." اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔" کون جانے ممکن ہے قلعہ کے نیچے میدان میں ہی بسیرا ڈالنا پڑے۔ پھر گوروں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر گاہک کھڑا کرنا۔ ان کے ہنٹر کھا کر پیٹھ ادھڑی کرانا، نشہ میں چُور تو رہتے ہیں وہ۔" لیکن اس کے دماغ پر امید کی چمک پیدا ہونے لگی۔ وہ حضرت ادیبا کے آستانہ سے مرادیں مانگ کر لائی تھی۔ اب ایسے بدنصیبی کا منہ نہ دیکھنا پڑے گا۔ حضرت اس کی مرادیں رد نہ کریں گے۔ اس کے چہرہ پر یقین کی شادمانی پیدا ہو گئی

شاما اسے دیکھ کر خواہ مخواہ مُسکرا دی اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ حضرت ادیبا کے لئے جذبہ شکر ان میں چھلکنے لگا۔

شاما نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عقیدت کے جوش سے اس کی زبان نہ کھل سکی۔ وہ دم بخود بیٹھ گیا۔ اس کے لب سلے ہوئے تھے لیکن نگاہیں کام کر رہی تھیں۔

گھبرائی سی متوحش نگاہیں۔ وہ غیر معمولی اشتیاق کی نظروں سے آنکھیں پھاڑے شاما کو تک رہا تھا۔ شاما اس کی وحشی نگاہوں سے کچھ ڈر سی گئی لیکن ہیٹ کی مار آئے ہوئے شکار کو ہاتھ سے کیوں کر جانے دیتی۔

شاما نے اس سے جلد ہی کاروباری باتیں شروع کرنا مناسب سمجھا۔

"دس روپیہ"۔ شاما نے انگلیوں سے بتاتے ہوئے کہا۔ "شاید وہ بہرا ہو"۔

اس نے دس روپے شاما کے آگے رکھ دئیے۔

شاما اسے پاز و کی کوٹھری میں لے گئی۔ پلنگ پر سفید چادر بچھی تھی۔ شاما نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاما اس کے قریب بیٹھ گئی۔ لیکن اس نے نہ کوئی بات کی نہ کسی طرح کا اقدام۔ شاما پر پھر خوف کی جھرجھری پھیل گئی۔ "دیوانہ معلوم ہوتا ہے" شاما کو اس سے ڈر لگنے لگا لیکن اس نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی اور قریب ہو کر اسے چھیڑنے لگی۔ وہ جلد ہی اس سے فارغ ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے اندر کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ وہ ویسا ہی بے حس بیٹھا رہا، شاما کے چہرہ پر نگاہیں جمائے جیسے اس کے جسم کی روح نکل کر آنکھوں میں وداعی چمک پیدا کر رہی ہو۔ شاما نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنے گال اس کے لبوں کے قریب کرنے لگی۔

اس نے ایک چیخ ماری "ماں" اور ننھے بچے کی طرح شاما کی گود میں سسکیاں لینے لگا۔

(آج کل، دہلی۔ ۱۹۴۴)

خون کا اثر

"دیکھئے نا ان کے بدن میں چار آنہ بھر خون نہیں ہے۔ ایسا حالت میں تندرستی کیسا کر کے اچھا رہ سکتا ہے۔" ڈاکٹر گھوش نے زبیدہ کا پپوٹہ جھکاتے ہوئے کہا۔ چھوٹے چھوٹے باریک کیڑوں جیسی اجلی اجلی دھاریاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"ایک بات کا بندوبست کیجئے۔ کوئی تندرست آدمی ہونے سے اس کے بدن کا خون نکال کر ۵۰ سی سی کے اندراج سے ان کو ٹرنسفیوژن کیا جائے۔"

"ہفتہ میں دو بار کرنے ہوگا۔ ایک مہینہ کے اندر میں ایک دم ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"ڈاکٹر صاحب مشورہ تو مناسب ہے لیکن ویسا آدمی ملنا مشکل ہے۔" سعید نے شک کے لہجہ میں کہا۔

"مشکل کا ہے ہے؟" ڈاکٹر گھوش نے ایک مشاق شعبدہ باز کے انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "کوئی آدمی ہونے سے کام چل جائے گا۔ ہاں مگر تندرست ہونا چاہیئے۔ آپ کا ماچک ویک کونسٹی ٹیوشن کا نہیں۔ عمر بیس اور چالیس کے اندر ہو مگر کھوب تندرست ہو۔"

ڈاکٹر گھوش مشورہ دے کر چلا گیا۔ سعید کو ایک تندرست آدمی کی فکر ہوگئی کاش وہ خود اس قابل ہوتا!

جمن سعید کے یہاں عرصہ سے ملازم تھا۔ دس سال سے اسے کسی نے ایک دن کے لئے بھی بیمار ہوتے نہیں سنا تھا۔ لانبا قد، دہرا بدن، چکلا سینہ، بازو کی مچھلیاں چمکتی ہوئی۔ کالا چہرہ خون کی سرخی لئے ہوئے تازہ ہوگنی پالش کی طرح چمک دار موٹے موٹے ہونٹ لاکھ کی سیاہی مائل قلموں جیسے چکنے جن سے مہریں لگائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے چہرہ کی تراش سیاہ رنگ کے باوجود دلآویز تھی۔ "جمن کا خون استعمال ہوسکتا ہے۔" سعید نے خیال کیا۔ لیکن اسے گھن سی آنے لگی۔ کالی کالی رگوں سے بہتا ہوا گاڑھا گاڑھا خون جیسے کچی موری سے غلاظت نکل رہی ہو لیکن خون کا سامان آخر کرنا ہی تھا اور اس سے بہتر انتظام ناممکن۔

پہلے پہل جب جمن کے بدن سے خون نکالا گیا تو وہ پسینہ پسینہ ہوگیا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہنے لگتا تھا۔ ۵۰ سی سی کی سرنج جلد بھرتی بھی تو نہیں! پسٹن کچھ اتنا دھیرے دھیرے اوپر چڑھتا تھا جیسے دیکھنے میں بالکل ٹھہرا ہوا ہو۔ صرف سرنج کا سفید کانچ رفتہ رفتہ رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ جیسے محنت کا خون غیر محسوس طریقہ سے سرمایہ داری کے رخسار پر منتقل ہوتا جا رہا ہو۔ سرنج جب بھر کر جمن کے رگ سے ہٹائی گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اسے کوئی خاص تکلیف نہ پہنچی تھی۔ صرف اس کا جی بے قابو ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ شوق سے خون دینے کے لئے آمادہ ہو جایا کرتا۔ آخر اتنے دنوں سے ساتھ رہتے رہتے اسے

سعید سے انس بھی تو ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر گھوش کی پیشین گوئی دن بہ دن صحیح ہوتی جا رہی تھی۔ زبیدہ دیکھتے دیکھتے جیسے نئے سر سے جوان ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے گال پر جو مہینوں سے مکھانہ کی طرح سفید اور بے رونق ہو رہے تھے انار کی سرخی نمودار ہونے لگی تھی اس کے لبوں میں پھر سے گلاب کی پنکھڑی کی طرح رس بھرتا جا رہا تھا۔ اس کی خمیدہ کمر پھر سرو کی طرح کشیدہ قامت بنتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم میں گوشت بھی بھرتا جا رہا تھا، اور اس کے اعضا پھر سے اپنا کھویا ہوا تناسب حاصل کر رہے تھے۔

زبیدہ کے اعادۂ شباب پر سعید سائنس کے امکانات اور ڈاکٹر گھوش کی صلاحیت کا دلدادہ ہو رہا تھا۔ لیکن ایک بات اس کے دل میں کھٹکتی رہتی "زبیدہ کی رگوں میں جمن کا خون دوڑ رہا تھا" اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جمن زبیدہ کی روح میں حلول ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگتے۔ بچپن کی سنی سنائی باتیں زبیدہ کے شباب کی طرح از سر نو جاگتی جا رہی تھیں۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ ہزار دشمنی بھی خون کا اثر نہیں مٹا سکتی۔ خطرناک مقدمہ بازیوں کے باوجود جب بھی اس کے باپ اور چچا کی نگاہیں چار ہو جاتیں تو دونوں کے خون میں جوش سا پیدا ہونے لگتا اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ "دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون تو تھا"۔ لیکن پھر وہ اسے صرف واہمہ تصور کرنے لگتا۔ "جب خون کا اتنا اثر تھا تو پھر دونوں میں دشمنی بھی کیوں پیدا ہوئی؟" ماں کی باتیں اسے بے معنی نظر آنے لگتیں۔ "خون کا اثر وثر کچھ نہیں۔ بچپن کی صحبتیں، ایک گھر میں پرورش، آنکھیں ملتے ہی بھولی بسری باتیں زندہ ہو جاتی ہوں گی۔" پھر اسے وہ افسانہ یاد آ جاتا۔ جس نے اس کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔ اس وقت وہ پورا جوان نہ ہونے پایا تھا۔ ایک طوائف کی کہانی۔ باپ کے گناہ نے پیدا ہوتے ہی اسے والدین کی نظروں ہی سے نہیں بلکہ واقفیت سے بھی دور کر دیا تھا۔ اس کا باپ اپنے گناہ کی

مشق کی غرض سے اس کے یہاں عام گاہکوں کی طرح پہنچ کر چکائے ہوئے دام وصول کرنے کی فکر میں تھا۔ لیکن طوائف کو نہ جانے کس نامعلوم قوت نے سپردگی سے روک دیا تھا۔ طوائف کے دل میں احترام و محبت کے جذبات ابھر آئے تھے۔ باپ کی موجودگی سے اس کی رگوں کا خون جوش میں آگیا تھا۔ جب ہی تو اس کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ افسانہ کے خیال نے سعید کے دل میں جیسے ایک گہری چوٹ سی لگا دی۔ اس کے کان نے جیسے اس چوٹ کی آواز سنی۔ لیکن افسانہ پھر افسانہ ہی ہے۔ اس سے متاثر ہونا نری حماقت! جینٹک سائنس نے تو کبھی نسلی اثرات کے متعلق کوئی ایسا نظریہ پیش نہیں کیا؟ لیکن اسے اس سائنس میں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا ایک اہم باب اب تک تشنہ تکمیل تھا۔ خون کے اثر پر ریسرچ! اس موضوع پر ریسرچ ضروری تھا۔ وہ اگر ماہر سائنس ہوتا تو اس موضوع پر ضرور ریسرچ کرتا لیکن ریسرچ کب وثوق کے قابل ہے۔ سائنس میں روز روز نئی دریافتیں ہوتی رہتی ہیں۔ سب سچ تھوڑی ہی ہوتی ہیں۔ آج یہ بات صحیح ہے تو کل وہ۔ اسے اپنے کالج کا پروفیسر یاد آگیا۔ جو ریسرچ کے لئے مشہور تھا۔ کوئی بات تو نہ تھی اس کے اندر۔ اتنا غیر دلچسپ کلاس کا تو اسے کبھی بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ پروفیسر اس مشین کی طرح جس کے پرزے ڈھیلے ہو رہے ہیں رک رک کر اور طرح طرح کی شکلیں بنا بنا کر لکچر دیتا رہتا تھا۔ لیکن خون کا اثر! اس پر ضرور ریسرچ ہونا چاہئے تھا۔!

زبیدہ آئینہ کے سامنے کھڑی بال درست کر رہی تھی۔ اس نے باریک ریشمی بلاؤز اور سرخ جارجٹ کی ساری پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے بال سنوارنے کا فرض انجام دے رہے تھے۔ سعید اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ زبیدہ کے بازو کافی بھر گئے تھے۔ اور سینہ میں نمایاں ابھار پیدا ہو گیا تھا۔ سعید آئینہ میں اس کا عکس مشتاقانہ دیکھنے لگا۔ لیکن زبیدہ کے سینوں کے ارد گرد اسے موٹی موٹی سیاہ لکیریں ابھرتی دکھائی دیں۔ گاڑھے گاڑھے سیاہ خون کی دھاریاں

جو سینوں کے گرد پھیل کر بھدّی بھدّی انگلیاں بن گئیں۔ پھر وہ ان میں چُبھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ان میں سما کر کھو گئیں۔ زبیدہ کے ریشمی لبوں پر اسے دو سیاہ گھناؤنی جونکیں سی رینگتی ہوئی دکھائی دیں جو رفتہ رفتہ لبوں پر پھیل کر موٹے موٹے ہونٹ بن گئیں۔ سعید کی آنکھوں میں درد ہونے لگا اور اس کے قلب کی رفتار سست ہو گئی جیسے اس میں سیسہ بھر دیا گیا ہو۔

"واقعی میرے چہرہ پر اب کافی خون ہو گیا ہے۔" زبیدہ نے پلٹ کر کہا "میں تو صرف آپ کی ضد سے راضی ہوئی۔ بیچارہ جمن! غریب پر ترس آتا ہے۔"

سعید نے محسوس کیا جیسے زبیدہ کو جمن پر صرف ترس ہی نہیں آ رہا ہو۔ جیسے زبیدہ کے دل میں جمن کی جگہ بنتی جا رہی ہو۔ اس کا سر بھاری معلوم ہونے لگا اور دل میں چبھن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ باہر چلا آیا اور خیالات کی رو میں بہنے لگا "بھلا وہ جمن کو پیار کی نظر سے کس طرح دیکھ سکتی ہیں؟ وہ بھی اس کے مقابلہ میں" "شاید عورت کی نگاہ میں تندرست مرد ہی اچھا لگتا ہے۔" "توبہ! جمن کس کی نگاہ میں کھپ سکتا ہے؟" سعید آئینہ اٹھا کر اپنی صورت دیکھنے لگا۔ اپنی آنکھوں کے گرد حلقے اسے اندھے کنوئیں کی طرح تاریک اور بھیانک معلوم ہوئے۔ "پیشانی پر سکڑنیں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ کنپٹیوں پر بھی جھریاں نمودار ہوتی جا رہی ہیں۔ گال دن بہ دن اور پچکتے جا رہے ہیں"۔ جمن کی چمکدار چوڑی پیشانی اور اس کے ابھرے ہوئے گال سامنے آ گئے۔ "لیکن پھر بھی کوئی اس کے مقابلہ میں جمن کو ترجیح نہیں دے سکتا۔" جمن کی سیاہ موٹی جلد اسے ان بھینسوں کی طرح گھناؤنی معلوم ہونے لگی جس کا نصف بدن کیچڑ کے مکروہ غلاف سے ڈھکا رہتا ہے۔ "جانور تو ہے ہی۔ کسی انسان کی نگاہ میں کیا خاک اچھا لگے گا۔" "لیکن شاید خون کا اثر۔۔۔۔۔! یہ طریقہ بے حد بُرا ہے۔ آدمی کا خون اس بے رحمی سے نکال لینا۔ بلڈ بینک تو اس زمانہ کی بہترین دریافت ہے۔ میدان جنگ میں اس کی بدولت کتنی زندگیاں

مونٹ کے منہ سے نکالی جارہی ہیں۔ مگر اس کے نتائج بڑے خطرناک ہیں۔" اسے
بلڈ بینک کا مستقبل نظر آنے لگا۔ بے بس مزدوروں اور بے زبان کسانوں کا
قافلہ کا قافلہ بیڑیوں میں جکڑا کشاں کشاں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ ان سب کے
ہاتھوں میں سرنج کی چبھتی ہوئی سوئیاں۔ امیروں اور سرمایہ داروں کا گروہ ان کے
خون لے لے کر اپنی مریض بیویوں اور بچّوں کے جسم میں منتقل کراتا ہوا دکھائی دیا۔
شاید دس سال بعد علاج کا یہ سب سے کامیاب اور سہل طریقہ سمجھا جائے۔ ٹانک
دینے کے عوض ڈاکٹر مریضوں کے لئے آدمی کا خون ہی تجویز کرنے لگیں۔ اسے یہ طریقہ
بڑا بھیانہ معلوم ہونے لگا۔" غریبوں کا خون چوسنے کی اصطلاح سچ مچ صحیح ہوجائے گی
واقعی سرمایہ داری ایک بڑی لعنت ہے۔ استحصالیت کا نظام مٹ جانا ہی چاہئے۔"
سعید کو سوشلزم کا نظام بہت اچھا معلوم ہونے لگا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اس نے
سوشلزم پر کوئی کتاب تک نہ پڑھی تھی۔ مارکس اور لینن کے خیالات کو دیوانہ کی
بکواس سمجھ کر برابر پس پشت ڈالتا رہا تھا۔ یہ اس کی بڑی بھول تھی۔ اس نے
محسوس کیا۔" مارکس کی کتاب ضرور پڑھنی چاہئے اور لینن کی شاید یہ کتابیں اس
کی الماری میں کہیں پڑی ہوں۔" وہ انہیں مشتاقانہ ڈھونڈھنے لگا۔ کتابیں
نہ ملیں۔" انہیں خاص آرڈر دے کر کلکتہ سے منگوائے گا۔" اس نے فیصلہ کیا۔ لیکن
خون کا اثر ——— ! اثر وثر کیا ہوگا؟ یا شاید ہوتا ہو۔ اس کا دماغ
ٹھنکنے لگا۔ اور سر کا بوجھ اور زیادہ ہوگیا۔ جیسے اس کا سر کسی وزن بیٹھ کے نیچے دبا ہوا
ہو ———

سعید اٹھ کر زبیدہ کے پاس چلا آیا۔
"آپ نے کچھ سنا! آپ کے صاحب زادہ نے سٹ والا آفتاب شہید کردیا۔"
زبیدہ نے سعید پر نظر پڑتے ہی فریاد سنائی۔" آپ نے اسے اتنا سہکا جو دیا ہے۔"
ٹوٹ گیا؟ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پورا سیٹ ردی۔ کس طرح ٹوٹا؟ اب ایسی

چیزیں برسوں دیکھنے کو بھی نہ ملیں گی۔ جنگ جلد ختم بھی ہو جائے تو سالہا بعد شاید
ان پر نظر پڑے۔ رکھا کہاں تھا جو ٹوٹ گیا؟" سعید نے برہمی کے لہجہ میں سوال کیا
رات دعوت میں جو نکالا گیا تھا۔ باہر صاف کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اچھے
نے ڈھیلا مار دیا۔ چینی کی چیز وہ! وہیں ٹوٹ کر رہ گیا۔"

"تو اس میں اچھے کا کیا قصور؟ اوپر پڑا ہوگا کھیل میں ڈھیلا لگ گیا۔
قصور تو اس طرح رکھ چھوڑنے والے کا ہے۔ جمن نے میدان میں چھوڑ دیا ہوگا۔ اس
طرح چیز ضائع ہوگی تو سارے گھر پر پانی پھر جائے گا۔ پچاس روپیہ کا اس وقت
کا تھا اب پانچ سو کو بھی نہ مل سکے گا۔" سعید غصّے میں بڑبڑاتا جمن سے قاب کی بابت
پوچھنے مردانہ میں چلا آیا۔

"جمن! یہ قاب کس طرح ٹوٹا؟" سعید نے تیور بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"سوکھنے کے لئے دھوپ میں چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹے میاں کھیل رہے تھے ان سے
ڈھیلا لگ گیا۔"

"شرم نہیں آتی تم کو؟ میرا اتنا بڑا نقصان کر دیا۔"

"حضور میرا کوئی قصور ...."

"منہ لگ کر بولے چلا جاتا ہے۔ بدتمیز۔" سعید غصّہ سے ہانپنے لگا۔
"بے ایمان چور۔ بدمعاش، مالک کی چیز جیسے مفت کی ہوتی ہے۔ اُلّو
کہیں کا۔ تیرے باپ کا کیا بگڑا۔ حرام زادہ، اُلّو کا بچّہ۔ میرا اتنا بڑا
نقصان کر دیا اور منہ لگ کر بولے چلا جاتا ہے۔" سعید کی آنکھوں سے چنگاریاں
سی نکل رہی تھیں اور چہرہ غصّہ سے انگارہ سا ہو رہا تھا۔

جمن سعید کے منہ سے گالیاں سننے کا عادی نہ تھا اسے بھی طیش سا آ گیا۔

"حضور گالی کیوں......"

"نکل جاؤ یہاں سے، دور ہو سامنے سے۔"

سید غصّہ کے مارے سارے جسم سے کانپ رہا تھا۔

"ابھی جاؤ یہاں سے ورنہ مارے ہنٹر کے پیٹھ پھوڑ ڈالوں گا۔ جاؤ۔ جاتا ہے کہ نہیں۔ چلا جا......"

سید گرج رہا تھا۔

جمن چلا گیا!۔

(ساقی مئی ۱۹۴۴)